سرکاری قرضے

[مجموعہ مقالات مجلس تحقیقات شرعیہ ۱۹۷۱ء]

مرتب

رحمت اللہ ندوی

(استاذ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

ناشر

مجلس تحقیقات شرعیہ

Printed by Maktaba Ahsan, Lucknow Mob: 9335982413

ناشر:

مجلس تحقیقات شرعیہ

سرکاری قرضے

[مجموعہ مقالات مجلس تحقیقات شرعیہ ۱۹۷۱ء]

مرتب

رحمت اللہ ندوی

(استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

نظرِ ثانی

مولانا عتیق احمد بستوی

(ناظم مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

ناشر

مجلس تحقیقات شرعیه

ندوۃ العلماء، ٹیگور مارگ، لکھنؤ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	سرکاری قرضے
ترتیب وتحقیق	:	رحمت اللہ ندوی
نظرِ ثانی	:	مولانا عتیق احمد بستوی
کل صفحات	:	۱۵۲
سن اشاعت	:	اکتوبر ۲۰۲۲ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	/روپے

ناشر

مجلس تحقیقات شرعیه

ندوۃ العلماء، ٹیگور مارگ، لکھنؤ

ملنے کے پتے:

۱-مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، احاطہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، فون:0522.2741439

۲- مکتبہ ندویہ، احاطہ دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ، فون:8960997707

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضامین	صفحات
۱	مقدمہ: حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم	۴
۲	پیش لفظ: مولانا عتیق احمد بسوی (ناظم مجلس تحقیقات شرعیہ، لکھنؤ)	۸
۳	عرض مرتب	۱۱
۴	خطبۂ استقبالیہ وعرض مسئلہ: مولانا محمد برہان الدین سنبھلی صاحبؒ	۱۶
۵	تمہیدی تحریر اور سوالنامہ: مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ	۲۷
۶	صارفین کے لئے قرضوں کی نوعیت	۳۵
۷	رپورٹ: مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ	۴۶
۸	رپورٹ: مولانا سید منت اللہ رحمانی صاحبؒ	۵۵
	مقالات	
۹	جواب: مفتی محمد شفیع صاحبؒ، دارالافتاء، دارالعلوم کراچی، پاکستان	۶۰
۱۰	جواب: مولانا محمد یحییٰ قاسمیؒ، مفتی دارالافتاء، امارت شرعیہ بہار	۶۴
۱۱	جواب: مولانا عبدالعزیز رائے پوریؒ، دارالافتاء مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور	۷۲
۱۲	جواب: مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ، دارالافتاء دارالعلوم دیوبند	۸۰
۱۳	جواب: مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ، دارالافتاء مدرسہ امینیہ، دہلی	۹۹
۱۴	جواب: مولانا عبدالصمد رحمانیؒ، دارالتالیف مانڈر، ضلع کھگڑیا	۱۰۳
۱۵	جواب: مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی	۱۱۵
۱۶	جواب: مولانا شمس الحق صاحبؒ، شیخ الحدیث جامعہ رحمانی، مونگیر	۱۱۸
۱۷	جواب: مولانا سید احمد عروج قادریؒ، ایڈیٹر ماہنامہ ''زندگی'' رامپور	۱۲۷
۱۸	جواب: مولانا محمد وجیہ صاحبؒ، مدرسہ دارالعلوم الاسلامیہ، ضلع حیدرآباد، پاکستان	۱۳۱
۱۹	تجاویز (مجلس تحقیقات شرعیہ)	۱۳۶
۲۰	آل انڈیا اسلامک فقہ اکیڈمی کی تجاویز اور فیصلے	۱۴۱
۲۱	ادارۃ المباحث الفقہیہ کی تجاویز اور فیصلے	۱۴۵
۲۲	تجویز متعلق منتقلی قبر حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ	۱۴۹
۲۳	مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء- چند اہم مقاصد	۱۵۱

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین، وعلی آلہ وصحبہ أجمعین، أما بعد!

اسلام دین کامل ہے، خاتم الأنبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ پر جو دین نازل ہوا وہ قیامت تک کے لئے انسانوں کی رہنمائی کے لئے کافی ہے، کتاب وسنت میں جو اصول وتعلیمات درج ہیں ان کی روشنی میں ہر دور کے نت نئے مسائل کا شرعی حل نکالا جاسکتا ہے، چنانچہ فقہاء امت نے دنیا کے مختلف ممالک میں پیش آنے والے مسائل کا حل کتاب وسنت اور ادلۂ شرعیہ کی روشنی میں پیش کیا، اور انسانیت کی ہمہ جہت رہنمائی فرمائی، دور نبوی اور دور صحابہ سے لے کر دورِ حاضر تک نئے مسائل کے بارے میں حکم شرعی دریافت کرنے کے لئے انفرادی اور اجتماعی سطح پر کامیاب کوششیں ہوتی رہیں، اور اس کے نتیجے میں فقہ اسلامی کا عظیم الشان سرمایہ تیار ہوا، جس کی نظیر دنیا کی کسی دوسری قوم اور کسی دوسرے مذہب والوں کے یہاں نہیں ملتی۔

۱۹۴۷ء میں برصغیر ہندو پاک کو انگریزوں سے آزادی ملی، لیکن اسی کے ساتھ تقسیم ہند کا حادثہ بھی پیش آیا، جس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمان ایسے سنگین اور خطرناک حالات سے دوچار ہوئے جن کا تصور بھی ان کے دل ودماغ میں نہیں تھا، تقسیم ہند کے بعد ہندوستان کی مسلم قیادت سیاسی طور پر انتہائی کمزور ہوگئی، لاکھوں مسلمان شہید ہوئے، آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کا وجود خطرے میں پڑ گیا، فسادات کا نہ تھمنے والا سلسلہ ان کے سامنے تھا، فوری ضرورت اس چیز کی ہوئی کہ مسلمانوں کی جان ومال، عزت وآبرو کا تحفظ کیا جائے، اور ہندوستان میں ان کے قدم جمائے جائیں۔

آزادی کے بعد مسلمانوں کی ایک شرعی ضرورت یہ بھی تھی کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو جو چیلنجز درپیش ہیں، اور جس طرح کے پیچیدہ مسائل کا سامنا ہے، ان کا شرعی حل تلاش کیا جائے، اور معتبر علماء اور ممتاز فقہاء کی کوئی مجلس اجتماعی غور وخوض کے لئے قائم کی جائے جو ان کا شرعی حل پیش کرے۔

اس ضرورت کا احساس کر کے جن بزرگوں نے قدم بڑھانے کا فیصلہ فرمایا، ان میں سرفہرست مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے، اور اس کام میں ان کی بھرپور معاونت کرنے والے بزرگوں میں حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ مدیر ماہنامہ ''الفرقان'' لکھنؤ، حضرت مولانا شاہ منت اللہ رحمانی امیر شریعت بہار واڑیسہ اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی وغیرہم رحمہم اللہ تھے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی دعوت پر یکم ستمبر ۱۹۶۳ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ملک کے منتخب اہل فکر علماء کا ایک مشاورتی جلسہ ہوا تھا، جس میں نئے حالات سے پیدا ہونے والے مسائل پر شرعی نقطۂ نظر سے غور وخوض اور ملت کی رہنمائی کرنے کے لئے ''مجلس تحقیقات شرعیہ'' کے قیام کا فیصلہ کیا گیا، مجلس کے مقاصد، طریقۂ کار وغیرہ طے کئے گئے۔

چند سال تک مجلس تحقیقات شرعیہ بہت متحرک اور فعال رہی، متعدد اہم موضوعات پر اس کی مشاورتی میٹنگیں ہوئیں، انشورنس، رویت ہلال، سرکاری قرضوں وغیرہ پر ہندوپاک کے ممتاز علماء اور فقہاء سے مقالات لکھوائے گئے، فتاوی حاصل کئے گئے، اور مشاورتی میٹنگوں میں غور وخوض کے بعد فیصلے کئے گئے، ۱۹۷۱ء میں مجلس تحقیقات شرعیہ کی پانچویں مشاورتی نشست ہوئی، جو سرکاری قرضوں کے موضوع پر تھی، بعض اسباب کی بنیاد پر اس کے بعد کوئی مشاورتی نشست منعقد نہ ہوسکی، اگرچہ مجلس تحقیقات شرعیہ اس کے بعد بھی قائم رہی، اور جناب مولانا برہان الدین سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ اس کے تحت نئے مسائل پر تحقیق وتصنیف کا کام کرتے رہے، لیکن اجتماعی غور وخوض اور فیصلے کا کام موقوف رہا۔

دوڈھائی سال قبل دل میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ مجلس تحقیقات شرعیہ کو دوبارہ ماضی کی طرح متحرک کیا جائے، اور اس کے ذریعہ نئے مسائل پر اجتماعی غور وخوض کے سلسلہ کا آغاز کیا جائے، جناب مولانا برہان الدین سنبھلی کئی سال سے مکمل معذوری کی حالت میں تھے، اس لئے اس کام کی ذمہ داری دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ مولانا عتیق احمد بستوی کے ذمہ کی گئی، انہیں مجلس تحقیقات شرعیہ کا ناظم مقرر کیا گیا، اور الحمدللہ جب سے ان پر یہ ذمہ داری آئی ہے اور چند اساتذہ کو ان کا معاون نامزد کیا گیا ہے، مجلس تحقیقات شرعیہ دوبارہ متحرک ہوئی ہے۔

اس مدت میں ایک کام یہ ہوا ہے کہ جن موضوعات پر مجلس تحقیقات شرعیہ کے ابتدائی چند سالوں میں مشاورتی میٹنگیں یا مذاکرہ کی مجلسیں ہوئیں، ان پر مقالات وفتاوی حاصل کئے گئے، انہیں نئے انداز سے شائع کرنے کے لئے مرتب کرایا گیا، تاکہ چوٹی کے اہل علم کی یہ علمی اور فقہی تحریریں شائع ہوکر وقف عام ہوسکیں، اور اہل علم ان سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔

جن موضوعات پر مجلس تحقیقات شرعیہ نے اجتماعی غور وخوض کا کام ابتدائی ادوار میں انجام دیا تھا ان میں سے ایک اہم موضوع سرکاری قرضوں کا بھی تھا، حکومت ملک کے باشندوں کی فلاح وبہبود اور ان کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے جو اسکیمیں بناتی ہے ان میں سے ایک شکل یہ ہے کہ وہ مختلف کاموں کی انجام دہی یا مختلف ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے سودی قرضے مہیا کرتی ہے، عام طور سے ان قرضوں میں سود کی شرح بہت کم ہوتی ہے، بعض دفعہ قرض کا کچھ حصہ معاف بھی کردیا جاتا ہے، ان قرضوں کے جواز اور عدم جواز کے مسئلے پر مجلس تحقیقات شرعیہ نے سوالنامہ جاری کر کے مقالات اور جوابات حاصل کئے اور مئی ۱۹۷۱ء میں مجلس تحقیقات شرعیہ کی پانچویں مشاورتی نشست (جس کے بعد کوئی اور اجتماعی مشاورتی نشست منعقد نہیں ہوئی) منعقد ہوئی جس میں چوٹی کے اہل علم نے شرکت فرمائی، اس موضوع کے مقالات اور تحریریں مجلس تحقیقات شرعیہ کے آفس میں محفوظ تھیں جو

انتہائی بوسیدہ حالت میں تھیں، ان مقالات اور تحریروں کو شائع کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا، کیونکہ یہ موضوع آج بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

سرکاری قرضوں کے موضوع پر موصول ہونے والے مقالات اور فتاوی اور اس سے متعلق تحریروں کو مرتب کرنے اور اس کی تحقیق کا کام انجام دینے کی ذمہ داری دارالعلوم ندوۃ العلماء کے استاذ اور مجلس تحقیقات شرعیہ کے علمی رفیق مولانا رحمت اللہ ندوی کے ذمہ کی گئی، الحمدللہ انھوں نے اس کام کو دلچسپی اور محنت سے سلیقہ مندی کے ساتھ انجام دیا، بوسیدہ تحریروں کو پڑھا، اصل فقہی کتابوں کی طرف مراجعت کی، حوالوں کی مکمل نشاندہی کی جہاں ضرورت محسوس کی حواشی لکھے اور جن بزرگوں کے مقالات وتحریریں اس مجموعہ میں شامل ہیں ان پر تعارفی نوٹ بھی لکھے، اللہ تعالیٰ اس علمی اور تحقیقی خدمت کو قبول فرمائے اور اس مجموعہ کو اہل علم کے لئے مفید تر بنائے اور ان کی علمی اور دینی ترقیات کے لئے دعا کرتا ہوں، مجلس تحقیقات شرعیہ کے ناظم مولانا عتیق احمد بستوی کی رہنمائی میں انھوں نے یہ خدمت انجام دی ہے، اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کو عمر اور صحت میں برکت دے اور ان کی خدمات کو قبول فرمائے، آمین۔

۵/ربیع الاول ۱۴۴۴ھ — محمد رابع حسنی ندوی
۲/اکتوبر ۲۰۲۲ء — ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

الحمد للّٰہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی خاتم الأنبیاء والمرسلین وعلی آلہ وصحبہ أجمعین، أما بعد!

انشورنس کے موضوع پر فیصلے کے بعد مجلس تحقیقات شرعیہ نے جن موضوعات کو بحث وتحقیق کے لئے منتخب کیا، وہ موضوعات تھے سرکاری قرضے اور رویت ہلال، سرکاری قرضے کے مسئلے پر سوالنامہ مجلس تحقیقات شرعیہ کے دوسرے ناظم حضرت مولانا اسحاق سندیلوی رحمۃ اللہ علیہ نے تیار کیا، ۲۸/فروری ۱۹۶۶ء کو یہ سوالنامہ روانہ کیا گیا، مجلس تحقیقات شرعیہ کی چوتھی مشاورتی نشست ۳، ۴/مئی ۱۹۶۷ء کو منعقد ہوئی، اس میں رویت ہلال، سرکاری قرضہ جات اور بعض دیگر موضوعات زیر بحث آئے، رویت ہلال کے بارے میں اتفاق رائے سے فیصلہ کیا گیا، لیکن سرکاری قرضوں کے موضوع کو آئندہ کے لئے مؤخر کردیا گیا، اس موضوع پر مجلس کو ہندوپاک سے دس مقالات اور تحریریں موصول ہوئیں، اس کے بعد مجلس کی مشاورتی نشست منعقد ہونے میں مختلف اسباب کی وجہ سے غیر معمولی تاخیر ہوئی، ۱۹۷۰ء میں حضرت مولانا اسحاق سندیلوی رحمۃ اللہ علیہ کراچی، پاکستان منتقل ہوگئے، ان کے پاکستان جانے کے بعد حضرت مولانا محمد برہان الدین سنبھلی (جو ۱۹۷۰ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاذ مقرر کئے گئے تھے) کو مجلس تحقیقات شرعیہ کا ناظم مقرر کیا گیا، ان کے ناظم مقرر کئے جانے کے بعد مجلس تحقیقات شرعیہ کی مشاورتی نشست ۱۵، ۱۶/مئی ۱۹۷۱ء کو دارالعلوم ندوۃ العلماء میں منعقد ہوئی جس میں سرکاری قرضوں کے موضوع پر تفصیل سے غور وخوض کیا گیا، اس موضوع پر جو مقالات موصول ہوئے تھے انہیں پڑھ کر حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی اور حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب نے

اپنی تحریری رپورٹ پیش کی اور مشاورتی نشست کے آغاز میں مجلس تحقیقات شرعیہ کے ناظم مولانا محمد برہان الدین سنبھلی نے خطبۂ استقبالیہ اور عرضِ مسئلہ پیش کیا، تجاویز بھی تیار کی گئیں تھیں لیکن ان پر اتفاق رائے نہیں ہوسکا، اور اس مسئلے کو آئندہ کے لئے ملتوی کردیا گیا، پیش کردہ تجاویز کا متن اس مجموعے کے اخیر میں شامل ہے، افسوس یہ ہے کہ پانچویں مشاورتی اجلاس ۱۵، ۱۶ رمئی ۱۹۷۱ء کے بعد آئندہ پھر مجلس کا کوئی مشاورتی اجلاس منعقد نہیں ہوسکا جس میں اس مسئلے پر مزید غور وخوض کرکے کسی فیصلے تک پہونچا جاتا، اجتماعی غور وخوض کا یہ مفید سلسلہ موقوف ہوگیا، حالانکہ مجلس تحقیقات شرعیہ اس کے بعد بھی قائم رہی اور حضرت مولانا محمد برہان الدین سنبھلی رحمۃ اللہ علیہ انفرادی طور پر مجلس تحقیقات شرعیہ کے تحت مختلف فقہی تحریریں لکھتے رہے اور علم وتحقیق کا کام انجام دیتے رہے، حیرت اس بات پر ہے کہ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی رپورٹ میں جو انتہائی محتاط تجویز تیار کی تھی اس پر بھی اتفاق رائے نہ ہوسکا، مولانا کی پیش کردہ تجویز کا متن یہ ہے:

> ''مذکورہ بالا حالات وحقائق کی روشنی میں مجلس تحقیقات شرعیہ کسی عام حکمِ شرعی کا اعلان کئے بغیر یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اگر کوئی شخص جو معاشی پریشانی وپراگندگی میں مبتلا ہے اور وہ یقین کرتا ہے کہ مذکورہ بالا قسم کے قرض کے بغیر اس کا کام چل ہی نہیں سکتا تو وہ اپنی مجبوریاں اور ضروریات کسی عالم اور مفتی کے سامنے پیش کرکے اور ان سے اذن حاصل کرکے مذکورہ بالا قسم کے قرض سے استفادہ کرسکتا ہے۔''

سرکاری قرضوں سے متعلق مقالات اور تحریریں اب تک شائع نہیں ہوسکی تھیں، جن حضرات نے علمی ریاضت ومحنت اور انتہائی غور وخوض کے بعد اس موضوع پر مقالات یا فتاوی لکھے تھے اب وہ سب اللہ کے حضور میں پہونچ چکے ہیں اور سب انتہائی بلند پایہ شخصیات ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرکے اور درجات بلند کرے۔

ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی دامت برکاتہم نے چند سال قبل

جب مجلس تحقیقات شرعیہ کو دوبارہ متحرک کرنے کا فیصلہ فرمایا اور احقر کو یہ ذمہ داری سونپی تو اس وقت یہ بھی فیصلہ ہوا کہ جن موضوعات پر مجلس تحقیقات شرعیہ اجتماعی غور وخوض کرچکی ہے اور ان کا ریکارڈ مجلس کے دفتر میں موجود ہے، انہیں مرتب کرکے شائع کیا جائے، تاکہ یہ اہم ترین علمی امانت اہل علم کی خدمت میں پہونچ جائے۔

سرکاری قرضوں کے موضوعات پر موصول ہونے والے مقالات، تحریرات وفتاوی کی ترتیب وتحقیق کی ذمہ داری جناب مولانا رحمت اللہ ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سپرد کی گئی، انہیں فقہی موضوعات سے اچھی مناسبت ہے، اور فقہی سمیناروں میں شریک ہوتے رہتے ہیں، الحمدللہ انہوں نے پوری سلیقہ مندی اور محنت سے اس کام کو انجام دیا، بڑی محنت اور دیدہ ریزی سے بوسیدہ تحریروں کو پڑھا، اصل حوالوں کی طرف مراجعت کی، حوالوں کی تکمیل کی، جابجا مفید حواشی بھی لکھے اور جن اکابر علماء کی تحریریں اس مجموعے میں شامل ہیں ان پر تعارفی نوٹ بھی لکھے، اللہ تعالیٰ ان کی خدمت کو قبول فرمائے اور علم وتحقیق میں ترقیات سے نوازے، آمین۔

عتیق احمد بستوی

۲/ اکتوبر ۲۰۲۲ء (ناظم مجلس تحقیقات شرعیہ، ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مرتب

اسلام ایک کامل دین اور مکمل نظامِ حیات ہے، اس کی تعلیمات زندگی کے ہر شعبہ پر محیط ہیں، ہر مرحلہ پر اس کی رہنمائی اور حکم موجود ہے، چونکہ یہ ایک جامع، آفاقی اور ابدی دین ہے، اس لئے اس کے احکام میں وسعت وآفاقیت ہے، یہ قدم قدم پر رہبری کرتا اور ہر موڑ پر ساتھ دینے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے، لیکن افسوس کہ مغربی فکر ونظر کے حامل کچھ لوگ یا اس سے مرعوب تجدد پسند اور روشن خیال سمجھے جانے والے حضرات، اسلام دشمن افراد کی سُر میں سُر ملاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسلام اب قدیم دین ہوگیا ہے اور اس میں موجودہ دور کا ساتھ دینے اور انسانیت کی کامل رہبری کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی، یہ ان کی خام خیالی ہے، اسلام اپنے آغاز اور عہد اول کی طرح آج بھی تازہ، شاداب، اور جوان ہے، اس میں کوئی قدامت یا کہنگی نہیں، اسلام نے ہر دور کے نئے چیلنجز کو قبول کیا ہے اور ہر زمانہ میں نئے پیش آمدہ مسائل کا حل پیش کیا ہے، اور انسانیت کی رہنمائی کی ہے۔

حالات اور آلات اور زمانہ کی جدید ترقیات نے جہاں سہولت پیدا کی ہیں، وہیں نت نئے مسائل کو بھی جنم دیا ہے، عہد جدید کے نئے پیش آنے والے مسائل میں ایک اہم، نازک اور حساس مسئلہ ''**سرکاری قرضے**'' سے استفادہ کا ہے، اب یہ مسئلہ بڑی حد تک قدیم ہوگیا، اگرچہ اس کی کچھ جزئیات نئی ضرور ہیں، سرکار اور حکومت اپنے شہریوں کو فائدہ

پہونچانے کے لئے جو اسکیمیں تیار کرتی یا قرضوں سے متعلق تفصیلات جاری کرتی ہے، ان میں سے بیشتر صورتوں میں سود کی آمیزش ہوتی ہے، کسی شکل میں سود کی شرح بالکل معمولی برائے نام ہوتی ہے اور کسی صورت میں شرح سود کچھ زیادہ ہوتی ہے، سود اور اس کے جملہ اقسام واشکال کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے، اس سلسلہ میں بڑی سخت وعیدیں آئی ہیں، جو اس کتاب کے مختلف مضامین ومقالات میں درج ہیں، انشاء اللہ قارئین کرام ان سے استفادہ کریں گے۔

اگر سود کے بغیر قرض ہو تو کوئی مسئلہ نہیں، لیکن اگر قرض میں خواہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری، سود شامل ہے، تو اس پر سوال پیدا ہوتا ہے جواز اور عدم جواز کا، پھر اگر اضطراری حالت ہے اور اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں یا اس کا کوئی متبادل نہیں تو شرعی رخصت اور سہولت کا بوقت ضرورت اور بقدر ضرورت فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے جب کہ عام حالات میں سودی لین دین میں مبتلا ہونے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

آج سے ۵۵/سال قبل ۲۸/فروری ۱۹۶۶ء میں ''**سرکاری قرضے**'' کا حکم دریافت کرنے کے لئے ''مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء'' کے ناظم مولانا محمد اسحاق سندیلوی ندویؒ نے ایک تفصیلی سوالنامہ تیار کرکے اس وقت کے کبار علماء اور مشہور ارباب افتاء نیز معروف دارالافتاء کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء کی طرف سے بھیجا تھا، جس میں قرضہ لینے کی ضرورت، اس کے نقصانات، افراد کو حکومت کی طرف سے دیئے جانے والے قرضے، ملازمین کو ملنے والے قرضے، امداد باہمی سوسائیٹیوں کے ذریعے دیئے جانے والے قرضے، مالیاتی اداروں اور سود اور ٹیکس میں فرق کو تفصیل سے واضح کیا گیا تھا، اس پر اہل علم اور اصحاب قلم کی طرف سے طویل اور مختصر دس تحریریں اور مقالات موصول ہوئے، اور کئی نشستوں کے بعد تجاویز پاس ہوئیں، جن کی تفصیل ''مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء۔ مختصر تاریخ اور تشکیل نو کا خاکہ'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔

لیکن یہ قیمتی تحریریں فائلوں میں بند اور الماریوں میں محفوظ تھیں، اللہ تعالی بہت

جزائے خیر دے استاذ محترم مولانا مفتی عتیق احمد صاحب بستوی مدظلہ کو کہ جب آپ ''مجلس تحقیقات شرعیہ'' کے ناظم وسکریٹری منتخب ہوئے تو آپ نے مجلس کے احیاء کا کام بڑی فکر مندی سے شروع کیا، اساتذہ واہل علم کو جوڑا، پھر ایک کارواں بنا کر آگے بڑھے اور مجلس کی ترقی کے لئے لائحۂ عمل تیار کیا، اسی طرح آپ کو ان قیمتی تحریروں اور مقالات کی ترتیب وتحقیق اور طباعت واشاعت کی فکر ہوئی، جو بہت بوسیدہ، دیمک زدہ ہوگئی تھیں اور اگر کچھ دن اور فکر نہ کی جاتی تو ضائع ہوجاتیں۔

مولانا موصوف نے ذمہ داران ندوہ اور اراکین مجلس کے مشورے اور تعاون سے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے چند اساتذہ کو مجلس کے علمی کاموں میں معاون مقرر کیا، تمام تحریروں کو مرتب کر کے منظر عام پر لانے کا پورا خاکہ تیار کیا، اور مختلف اساتذہ کو کام تفویض کردیا، مجھے ''**سرکاری قرضے**'' کے موضوع پر موصول ہونے والے مقالات کو مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی، جس میں دس مقالات کے ساتھ سوالنامہ، وضاحتی تحریر، دو رپورٹیں، خطبہ استقبالیہ وعرض مسئلہ اور تجاویز نیز ادارۃ المباحث الفقہیہ، جمعیۃ علماء ہند اور اسلامک فقہ اکیڈمی دہلی کے فیصلے اور تجاویز بھی شامل ہیں۔

اس میں حسب ذیل کام ہوئے ہیں :

۱۔ اکثر مقالات بہت بوسیدہ اور خستہ حال ہوگئے تھے، بعض کرم خوردہ اور دیمک زدہ بھی، اس لئے سب کا عکس بڑی احتیاط کے ساتھ لیا گیا، اسی عکس کو ہم نے نقش بنایا، اور جہاں لفظ واضح نہ تھا، اصل سے مراجعت کی۔

۲۔ اکثر تحریروں کو پڑھنا آسان نہ تھا، جابجا اصلاحات کی گئی تھیں اور حاشیے تھے، ان سب کو کمپوزنگ کے بعد اصل سے موازنہ کیا گیا۔

۳۔ بعض تحریریں ایسی تھیں کہ ان کی بعض عبارتیں تشنہ تھیں، یا کسی کتاب سے اقتباس لینا تھا، جو رہ گیا تھا، ان کی تکمیل کی گئی۔

۴۔ حوالہ جات ناقص وناتمام تھے، ان کی تکمیل اور بعض مقامات پر حوالہ جات تحریر کئے

گئے، اسی طرح کامل حوالوں کا بھی اصل سے تقابل کیا گیا، اکثر مقالہ نگاروں نے مکمل حوالہ جات کے اندراج کا اہتمام نہیں کیا تھا، صرف کتاب کا نام لکھ دیا تھا، اقتباس کے نقل میں بھی چوک ہوگئی تھی، ان سب کو درست کیا گیا، اسی طرح بعض دیگر حوالوں کو بھی درج کردیا گیا ہے، بعض حوالوں کی تلاش میں بڑی مشقت اٹھانی پڑی اور ہفتوں لگ گئے۔

۵۔ جہاں حواشی کی ضرورت محسوس ہوئی وہاں وضاحت کے لئے حواشی لکھے گئے۔

۶۔ مقالہ نگار حضرات کا مختصر تعارف شامل کیا، بعضوں کے حالات تلاش کرنے میں بڑی دشواری کا سامنا ہوا مختلف حضرات سے رابطہ کر کے ان کے بارے میں معلومات حاصل ہوئیں، مفتی یحییٰ قاسمی امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے حالات بڑی مشکل سے دستیاب ہوئے۔

۷۔ ادارۃ المباحث الفقہیہ، جمعیت علماء ہند اور اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے بعض فیصلے اور تجاویز اس کتاب میں شامل کردیئے گئے ہیں، جن کا موضوع سے براہ راست تعلق ہے، تاکہ افادیت دوچند ہوجائے۔

آخر میں شکر گزار ہوں ذمہ داران ندوہ ومجلس کا، جنہوں نے اس علمی کارواں میں اس حقیر کو شامل کیا، اسی طرح بہت شکر گزار ہوں استاد گرامی جناب مولانا مفتی عتیق احمد صاحب بستوی کا، جن کی توجہ، عنایت اور شفقت ورہنمائی سے یہ کام تکمیل کو پہونچا اور اب جلد ہی طباعت کے مرحلہ سے گزرنے والا ہے، جزاہ اللہ خیراً، آپ ہندوستان کے نامور فقیہ، کامیاب مدرس، اور پختہ قلم اور صاحب بصیرت مؤلف ہیں، آپ کے قلم سے کئی اہم تالیفات منظر عام پر آکر اہل علم سے خراج تحسین حاصل کرچکی ہیں، آپ کی سب سے اہم خصوصیت افراد سازی اور خورد نوازی اور نئی نسل کی حوصلہ افزائی ورہنمائی ہے۔

برادرم عطاء الرحمٰن ندوی (آفس انچارج مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء) بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے سیٹنگ اور بعض حواشی کی کمپوزنگ کا صبر آزما مرحلہ، حوصلہ

وجرأت سے طے کیا، اسی طرح ان سب احباب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے کسی بھی مرحلہ میں کسی بھی طرح کا تعاون کیا، اللہ تعالی سب کو جزائے خیر دے۔

پروف ریڈنگ کی بھرپور کوشش کی گئی ہے اور صحت کا پورا التزام کیا گیا ہے پھر بھی خطا اور چوک کا امکان ہے، لہٰذا قارئین جہاں کہیں خطا پر مطلع ہوں تو ہمیں آگاہ کریں۔

آخر میں اللہ تعالی سے دعا گو ہوں کہ وہ اس عمل کو قبول فرمائے اور مجلس کو صحیح رخ اور بہتر نہج پر کام کرنے اور صحیح سمت میں آگے بڑھنے کی توفیق دے، اور ہر طرح سے دستگیری فرما کر درست رائے اور فیصلے تک پہنچنے کی سہولت وتوفیق دے۔

والسلام

دعا گو

رحمت اللہ ندوی

استاذ حدیث وفقہ

دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۱۴۴۲/۸/۸ھ

۲۰۲۱/۳/۲۱ء

☆☆☆☆

خطبۂ استقبالیہ

مولانا محمد برہان الدین سنبھلیؒ ☆

لائق صد احترام حضرات علماء کرام.....السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مجلس تحقیقات شرعیہ کے ایک خادم کی حیثیت سے اپنا اولین فریضہ سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات کی تشریف آوری پر جذبات تشکر وامتنان کا اظہار کروں کہ اس سخت موسم میں سفر کی کلفتوں کو برداشت کر کے مجلس میں شرکت کی زحمت فرمائی۔

☆ مولانا محمد برہان الدین سنبھلی (پ: ۵؍فروری ۱۹۳۸ء-ت: ۱۷؍جنوری ۲۰۲۰ء) ابتدائی تعلیم اردو، فارسی، حفظ وقراءت اپنے والد گرامی مولانا قاری حکیم محمد حمید الدین صاحب سے پائی، ابتدائی عربی اور متوسط درجات تک تعلیم کا مرحلہ اپنے وطن سنبھل کے مختلف مدرسوں میں طے کیا، اعلی تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی، اور ۱۹۵۸ء میں فارغ ہوئے، ۱۲-۱۳ سال تک مدرسہ عالیہ عربیہ فتح پوری دہلی میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی دعوت پر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تفسیر وحدیث وفقہ کے استاد کی ذمہ داری قبول کی، اور بعد میں صدر شعبۂ تفسیر ہوئے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن تاسیسی، اور اس کی مجلس عاملہ کے رکن، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے نائب صدر، دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کے رکن، مرکزی دارالقضاء اتر پردیش کی قاضی کونسل کے صدر کے طور پر ذمہ داریاں انجام دیں، اس کے علاوہ دیگر اداروں کے بھی رکن رہے، عربی خدمات پر صدر جمہوریہ ہند کے ایوارڈ سے بھی سرفراز کئے گئے، مجلس تحقیقات شرعیہ کے تیسرے ناظم رہے، پچاس سال تک تدریسی وغیر تدریسی بہت سی ذمہ داریاں سرانجام دیں۔

تفسیر اور فقہ وحدیث کا ذوق غالب تھا، مطالعہ میں وسعت وگہرائی، علم وقلم میں پختگی تھی، بڑے ذہین وفطین تھے، علمی اور فقہی موضوعات پر بہت سے مقالات وابحاث تحریر فرمائے، اسی کے ساتھ ایک درجن سے زائد کتابیں شرعی موضوعات پر تالیف فرمائی، جن میں قضایا فقہیہ معاصرہ (عربی)، معاشرتی مسائل، رؤیت ہلال کا مسئلہ، چند اہم دینی مباحث، موجودہ زمانہ کے مسائل کا شرعی حل وغیرہ کافی مقبول ومشہور ہیں۔

محترم حضرات!

جس احساس ذمہ داری اور ضرورت کے تحت مجلس کا مبارک قیام عمل میں آیا، اس کے ثمرات توقع سے کہیں زیادہ بہتر رونما ہوئے چنانچہ مجلس نے چند اہم قابلِ قدر ولائقِ ذکر فیصلے کئے، اور عوام کو ان سے باخبر کیا، جس کا تقاضہ تھا کہ جلد جلد آپ جیسے اصحاب علم، ارباب فتویٰ اور اہل نظر حضرات کو تکلیف دی جاتی رہتی۔ لیکن گذشتہ چند سالوں میں بعض سخت مشکلات اور غیر معمولی حالات کی بنا پر (جن کا آپ میں سے اکثر کو علم ہے) ایسا نہ ہوسکا کہ اہل علم کا اجتماع منعقد کیا جاتا اور اس سے بھرپور استفادہ کر کے حصول مقصد کے لئے راہ عمل تلاش کی جاتی، اس طرح عوام، اور اہل ملک کی وہ توقعات جو اس مجلس سے وابستہ تھیں، انھیں کما حقہ اس درمیان پورا کرنے کا موقعہ نہ مل سکا، مجلس تحقیقات شرعیہ کے صدر محترم جو نہ صرف ہند بلکہ بیرون ہند خصوصا ممالک عربیہ وبلاد اسلامیہ کے بسنے والے دیندار مسلمانوں میں معتد بہ دلوں کی دھڑکن، اور ان کی امیدوں کا اس عالم اسباب میں ایک سہارا ہیں، جناب موصوف کو مسلمانوں کے مسائل بالخصوص دینی ضرورتوں کا احساس اور ان کی فکری وذہنی رہنمائی کا خیال ہمہ وقت فکرمند، اور سراپا عمل بنائے ہوئے ہے، وہ طبعی طور پر مجلس میں نئی روح پھونکنے اور عملی طور پر اسے زیادہ فعال، مؤثر اور نافع بنانے کے لئے بے چین تھے، لیکن موانع سد راہ بنے ہوئے تھے۔

آنجناب کے اخلاص وجہد بلیغ کا کرشمہ ہے کہ وہ دشواریاں جو راہ میں حائل تھیں، بہت کچھ زائل ہوگئیں، اور وہ گھاٹیاں جن کا عبور کرنا مشکل نظر آرہا تھا بتائید ایزدی ان کا پار کر لینا آسان ہوگیا، فالحمد للہ علی ذلک، اس طرح پھر موقعہ آیا کہ خیار امت اور نخبہ علماء جمع ہوں اور ان کے اجتماع کو زیادہ سے زیادہ نتیجہ خیز، نافع اور مثمر بنایا جاسکے، تاکہ وقت کا چیلنج جو تمام مذاہب بالخصوص اسلام کو درپیش ہے، قبول کیا جائے، یعنی عصری مسائل کا حل پیش کر کے علمی شہادت دی جائے کہ اسلام دین خالد ہے اور ہر زمانہ میں رہنمائی کرنے کی اس میں صلاحیت ہے۔

مرسلہ سوال نامہ کے ذریعہ آج کی مجلس کا موضوع بحث تو معلوم ہو ہی چکا ہوگا، اس موضوع کی نزاکت واہمیت کے بارے میں آپ جیسے ذی علم اور باخبر حضرات کے سامنے کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مرادف ہے، اسی طرح ''ربوا'' کی شناعت اور عام مسلمانوں کی فلاکت بھی محتاج بیان نہیں، تاہم چند معروضات جن کی حیثیت سوالنامہ کے کچھ اشارات کی توضیح اور اس میں اٹھائے گئے مباحث کی مختصر تشریح کی ہے، اس کے ساتھ ہی اپنے محدود مطالعہ پر مبنی کچھ خیالات نہایت اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی جسارت کروں گا، اور اس کے لئے باادب اجازت چاہوں گا۔

موقر حضرات! زیر بحث مسئلہ اس اعتبار سے نازک ترین سمجھا گیا ہے کہ ایک طرف تو حکومت سے قرض لینے کے معنی بظاہر سود کا معاملہ کرنے اور ''ربوا'' کے جرم میں ملوث ہونے کے ہیں، کیونکہ عام طور پر کتب فقہ میں ''ربوا'' کی جو تعریفیں کی گئی ہیں وہ اس معاملہ پر صادق آتی نظر آرہی ہیں، مثلاً علامہ برہان الدین مرغینانیؒ نے ربوٰ کی تعریف اس طرح کی ہے:

"هو الفضل المستحق لأحد المتعاقدين في المعاوضة، الخالي عن عوض شرط فيه"

(هدايه ص۔۷۷ ۔ج۳)

عنایہ شرح ہدایہ میں ان لفظوں سے تعریف کی گئی ہے:

"هو الفضل الخالي عن العوض المشروط"

(عناية بر حاشيه فتح ص ۲۷٤ ج٥)

متعدد کتب معتبرہ میں اس کا حکم، جس سے ربوا کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے، یوں بیان ہوا ہے:

"كل قرض جر نفعا حرام إذا كان مشروطا"

(اشباہ بحوالہ درمختار اور اس کی شرح۔ص۱۷۴۔ج۴)

ربوا کی ملعونیت اور عنداللہ اس کی مغضوبیت ایک اظہر من الشمس حقیقت ہے، اس

سے زیادہ بھیانک بات اور کیا ہوگی کہ ربوا کا معاملہ اللہ تعالیٰ سے جنگ کرنے کے مساوی بتایا گیا اور اس کے بارے میں وہ آیت اتری جسے امام اعظم ابوحنیفہؒ نے بجا طور پر مسلمانوں کے لئے شدید تر اور نہایت خوفناک آیت کہا ہے:

"كان أبو حنيفةؒ يقول: هي أخوف اية في القرآن حيث أوعد الله المؤمنين بالنار المعدة للكافرين إن لم يتقوه" (مدارك بر حاشيه خازن ۔ص۲٦٦۔ج۱)

احادیث میں محض ''ربوا'' ہی نہیں اس کے شبہ تک سے بچنے کے لئے ہدایت کی گئی ہے، انہی وجوہ کی بنا پر صاحب ہدایہ کے الفاظ میں یہ مستقل اصل قرار پائی: "شبهة الربوا مانعة كحقيقة الربوا" محقق ابن ھمام نے اس پر "بالإجماع على منع بيع الأموال الربوية مجازفة وإن ظن التساوي" (فتح القدير ص ۲۸۰۔ ج٥) کا اضافہ کر کے جہاں یہ بتایا کہ احتمال سود باتفاق ممنوع ہے، وہاں معلوم ہوتا ہے کہ اس حقیقت کو بھی بے نقاب کرنا چاہا ہے کہ صرف احناف کے یہاں نہیں بلکہ تمام مکاتب فقہ میں یہ تسلیم شدہ اصل ہے، شریعت کی روح کو سامنے رکھتے ہوئے فقہائے کرامؒ کے ذکر کردہ جزئیات کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان حضرات نے کس درجہ اس کا اہتمام کیا ہے کہ معاملات میں سود کا شائبہ بھی نہ آنے پائے، یہاں ان جزئیات کا استیعاب مقصود نہیں ہے اور نہ یہ کام آسان ہے مگر بات کو واضح کرنے کے لئے ایک دو مثالوں کا پیش کر دینا شاید بے محل نہ ہوگا۔

فقہ کی شہرۂ آفاق کتاب شامی میں "شراء الشيئ اليسير بثمن غال لحاجة القرض" کے بارے میں شمس الائمہ حلوانی کا یہ قول نقل کیا گیا ہے "إنه حرام" (شامی ۔ص۱۷۵۔ج۴)

درمختار میں ایک قابل تعزیر اور نہایت ناپسندیدہ معاملہ کا ذکر کرنے کے بعد کہا گیا ہے: "أقبح من ذلك السلم أن بعض القرى قد خربت بهذا" ابن عابدین نے اس مسئلہ کی تشریح بایں الفاظ کی ہے: ''ما يفعله بعض الناس من دفع دراهم سلما على حنطة أو

نحوها إلى أهل القرىٰ بحيث يؤدى ذلك الى خراب القرية ''(شامی ''ردالمحتار'' للعلامہ محمد أمین بن عمر، الشہیر بابن عابدین ص ۱۷۶)

معاملہ ''ربوا'' کی اہمیت اور اس کی قباحت جاننے کے لئے یہ بات بھی کافی ہے کہ دارالاسلام میں غیر مسلموں کو بھی اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ سودی لین دین آپس میں بھی کرسکیں، حالانکہ اس کے علاوہ دیگر امور میں "دعهم وما يدينون" کی پالیسی اختیار کی جاتی ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں کی زبوں حالی اور ذلت ونکبت کی حد تک پہونچا ہوا ان کا افلاس ہے، جسے دور کرنے کی بظاہر اس کے علاوہ اور کوئی سبیل نظر نہیں آتی کہ حکومت کے سامنے دست سوال دراز کیا جائے، بلکہ شاید یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ریاست۔ جس کی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام باشندوں کو ان کی ابتدائی ضروریات فراہم کرنے کا انتظام کرے اس سے مدد لی جائے، بالفاظ دیگر اپنا حق مانگا جائے، مگر اس کی مدد اس شکل کے علاوہ اور کسی طرح حاصل نہیں کی جاسکتی ہے کہ امداد کے نام پر لی ہوئی رقم کو مع شئ زائد (مقررکی ہوئی شرائط اور شرح کے مطابق) اسے واپس کیا جائے لیکن یہی وہ صورت ہے جس پر ربوا کا اطلاق درست نظر آتا ہے۔ جو بہر حال ایک مسلمان کے لئے نہایت قبیح بلکہ خبیث چیز ہے۔

یہی وہ گتھی ہے جسے سلجھانا ہے کیونکہ اس کے بغیر آج کل زندگی کی گاڑی کا چلنا بظاہر دشوار نظر آتا ہے، اس مشکل کو حل کرنے کے لئے بعض علماء نے جن کے اخلاص ونیت پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے، فقہاء کی ان عبارتوں کا سہارا لیا ہے جن سے بظاہر بعض ناگزیر قسم کی ضرورتوں میں اسی نوع کے بعض معاملات کی گنجائش نظر آتی ہے۔

مثلاً ممتاز فقیہ زین الدین ابن نجیم مصری کی مشہور کتاب ''الاشباہ والنظائر'' کا نہایت معروف فقرہ "الضرورات تبيح المحظورات" (سوال نامہ میں بھی اس کو ذکر کیا گیا ہے) بار بار پیش کیا گیا ہے، اسی طرح کتاب مذکور کی اس سے بھی زیادہ تعجب خیز صراحت "يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الاشباہ ص ۱۲۹ مطبع تعلیمیہ) اول وہلہ میں چونکا دینے والی ہے، اور اس سے استدلال کرکے موجودہ مسائل کے بارے میں

رائے قائم کرنا مستبعد نہیں معلوم ہوتا، لیکن تھوڑی دیر کے لئے اس بحث کو اگر نظر انداز کر بھی دیا جائے کہ نصوص صریحہ کے مقابلے میں کسی بھی فرد یا جماعت کے اقوال کو اہمیت دی بھی جاسکتی ہے یا نہیں؟ تب بھی امعان نظر سے کام لینے اور ان ہی عبارتوں کو کہ جن سے بظاہر جواز معلوم ہو رہا ہے، سیاق وسباق سے ملا کر پڑھنے نیز اس کے ساتھ دوسرے مآخذ پر نگاہ ڈال لینے کے بعد ان ''استدلالوں'' کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہ جاتی، ساتھ ہی یہ بات بھی روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ان عبارتوں سے جو کچھ سمجھا جا رہا ہے وہ ان کا حقیقی مفہوم نہیں ہے اور حقیقۃ یہ نصوص سے معارض نہیں بلکہ ان کی شارح ہیں۔

مثلاً "الضرورات تبيح المحظورات" میں لفظ الضرورات کا مصداق متعین ہو جائے تو اس عبارت میں پھر کوئی ندرت نہیں رہ جاتی، ابن نجیم نے اس قاعدہ کی جو مثال پیش کی ہے اس سے ہی ان کی مراد متعین ہو جاتی ہے، فرماتے ہیں: "ومن ثم جاز أكل الميتة عند المخمصة" علاوہ ازیں کتاب کے شارح مایہ ناز فقیہ سید احمد الحموی نے ''ضرورۃ'' کی جو تعریف ذکر کی ہے اس کے بعد تو کوئی الجھن ہی باقی نہیں رہتی، فرماتے ہیں: "فالضرورة بلوغه حدا إن لم يتناول الممنوع، هلك أو قارب، وهذا يبيح تناول الحرام" (ص ۱۲۲) اس پر غور فرمائیے کہ عبارت مذکورہ کا یہ مفہوم آیت قرآنی میں بیان کردہ حکم "فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه" سے کیا کچھ بھی مختلف ہے۔ کبھی اس سے کمتر درجہ کی کچھ ضرورتوں کو یہی مقام دے کر ان کی بنا پر بھی بعض ممنوعات کے ارتکاب کی اجازت دے دی جاتی ہے جس کو اصطلاح فقہ میں ''حاجۃ'' سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسا کہ اشباہ میں ہی ہے: "الحاجة تنزل منزلة الضرورة" (ص ۱۲۹) لیکن حاجۃ کا جو مصداق فقہاء نے متعین کیا ہے اس کو سامنے رکھا جائے تو زیر بحث موضوع پر استدلال کی گنجائش پھر بھی نظر نہیں آتی، صاحب درمختار نے کتاب الزکوٰۃ میں ابن ملک سے ''حاجۃ'' کی حسب ذیل تفسیر نقل کی ہے: "مايدفع عنه الهلاك تحقيقا كثيابه أو تقديرا كدينه" اس کی مزید تشریح علامہ شامی نے اس طرح کی ہے:

"هي ما يدفع الهلاك عن الإنسان تحقيقا كالنفقة ودور السكنىٰ والات الحرب والثياب المحتاج إليها لدفع الحر اوالبرد أو تقديرا كالدين، فإن المديون محتاج إلى قضائه بما فى يده من النصاب دفعا عن نفسه الحبس الذى هو كالهلاك" (شامى ص٦ ج٢)

واضح رہے کہ حاجت کی مذکورہ تعریف وجوب زکوۃ کے موانع بیان کرتے ہوئے کی گئی ہے، جہاں نسبۃً سہولت اختیار کی جاسکتی ہے لیکن ''ربوا'' جو منہیات کے قبیل سے ہے، اس میں سختی کچھ سوا ہی ہوگی:

"لأن اعتناء الشرع بالمنهيات أشد من اعتنائه بالمأمورات ومن ثم جاز ترك الواجب دفعا للمشقة، ولم يسامح فى الإقدام على المنهيات"۔ (حموى "غمز عيون البصائر" للعلامة السيد أحمد بن محمد الحموى المصرى ص١٢٨)

ان امور کے بعد علامہ حموی کے چند جملے اور سن لیجئے:

"الحاجة كالجائع الذى لو لم يجد مايأكله لم يهلك غيرأنه يكون فى جهد ومشقة، وهذا يبيح الحرام ويبيح الفطر فى الصوم" (حموی ص۱۲۲)۔

تو اب غور طلب بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی زبوں حالی کیا اس درجہ کو پہونچ گئی ہے جسے ضرورت یا کم از کم حاجۃ کا نام دیا جاسکے؟ میرے خیال میں یہی وہ کلید ہے جو اس قفل کو کھول سکتی ہے۔

یہاں زمانۂ نبوت کا فقر وفاقہ اور پیٹ پر پتھر باندھے جانے والے واقعات سے صرف نظر کرنا بھی شاید مناسب نہ ہوگا، کیونکہ قرآن مجید، جس میں حرمت ربو کی آیتیں بھی

ہیں، اسی زمانہ میں نازل ہوا۔ مسلمانوں کا مدینہ طیبہ کے یہودی دولت مندوں اور مہاجنوں سے قریبی تعلق تھا، مگر کبھی (بلا سودی قرض کے علاوہ) کیا افلاس اور ہفتوں کی بھوک کے علاج کے لئے سودی قرض کی بات سوچی بھی گئی؟

یہاں سودی قرض کے جواز کو دارالحرب کے مسئلہ کی آڑ لے کر بھی حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قطع نظر اس کے کہ آج کل کسی حکومت کو اصطلاحی دارالحرب کہنا ممکن بھی ہے یا نہیں؟ اور اس کے جواز وعدم جواز پر فقہاء کے درمیان کیا اختلاف ہے؟ نیز اس کی اباحت کے لئے کیا کیا شرطیں اور پابندیاں ہیں؟ اس مسئلہ کا سہارا لیتے ہوئے شاید یہ بات فراموش کردی جاتی ہے کہ مسلمانوں کو دارالحرب میں صرف سود لینے کی اجازت ہے، سود دینے کی نہیں۔ جیسا کہ محقق ابن ہمام ودیگر فقہاء نے تصریح کی ہے:

"وقد التزم الأصحاب فى الدرس أن مرادهم من حل الربوا والقمار ماإذا حصلت الزيادة للمسلم نظرا إلى العلة" (فتح القدير ص٣٠١ ج٥)۔

شامی فقیہ ابن عابدین نے سیر کبیر ودیگر کتب معتبرہ کے حوالے سے اس بات کو پوری طرح منقح کرکے پیش کیا ہے، اور ان جملوں پر کلام ختم کیا ہے:

"فعلم أن المراد من الربوا والقمار فى كلامهم ما كان على هذا الوجه وإن كان اللفظ عاما، لأن الحكم يدار مع علته غالبا"۔ (درالمحتار ص١٨٨ ج٤)

ایک ضروری امر۔ جس کی طرف حکیم الامۃ حضرت اقدس مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے توجہ دلائی۔ اسے بیان کئے بغیر آگے بڑھنا شاید کتمان حق کے برابر سنگین بات ہو، علوم اشرف کے گنج گرانمایہ ''بوادرالنوادر'' میں صفحہ ۲۷۶ پر ہے:

''آیات تحریم ربوا میں ارشاد ہے:

"يأيها الذين امنو اتقوا الله وذروا ما بقى من الربوٰ إن

کنتم مؤمنین" اور ظاہر ہے کہ اس بقیہ ربا کا معاملہ جس وقت ہوا ہے، لینے دینے والے سب حربی تھے، تو اگر تحریم کے بعد حربی سے ایسا معاملہ جائز ہوتا تو تحریم کے قبل بدرجۂ اولیٰ جائز ہوتا اور وہ رقم حلال ہوتی تو اس کا ترک کرنا کیوں فرض ہے"؟۔

حکومت سے سود پر قرض لینے کی گنجائش کے لئے زیلعی شارح کنز کے حسب ذیل قول کو بطور دلیل استعمال کیا جانا بھی مستبعد نہیں ہے اور یہ غالباً آخری سہارا ہوگا جو اس باب میں فقہاء کے کلام سے لیا جاسکتا ہے اور مفید مطلب ہوسکتا ہے: "لا ربوا بين متفاوضين وشريكي عنان إذا تبايعا من مالها أي مال الشركة" (درالمختار ص ۹۸ ج ۴)

اس قول سے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ حکومت کے خزانہ میں جمع شدہ رقم گویا سب کی ملکیت ہے، اس طرح اس میں سب لوگ شریک ہیں، دریں صورت حکومت سے سودی لین دین کا معاملہ کرنا دو شریکوں کے درمیان معاملہ کرنے کے برابر ہوگا۔

لیکن اس استدلال کی حقیقت مغالطہ سے زیادہ نہیں، کیونکہ مال شرکت کے ذریعہ مشترک راس المال میں کمی بیشی کرنا چاہے وہ ایک شریک کی طرف منسوب ہو، دراصل کمی بیشی ہے ہی نہیں۔ اسی طرح شرکت کے مال کو اضافہ کے ساتھ واپس کرنا گویا ایک جیب سے نکال کر دوسری جیب میں رکھنے کے برابر ہے، ابن عابدین کی تشریح کے بعد اس دلیل کے تار و پود بکھر جاتے ہیں:

"قوله: إذا تبايعا من مال الشركة، الظاهر أن المراد إذا كان كل من البدلين من مال الشركة، أما لو اشترىٰ أحدهما درهمين من مال الشركة بدرهم من ما له..... هو عين الربا" (ص ۱۸۸ ج ۴)

ہاں! بعض لوگ اس مسئلہ کے ایک اور پہلو کی بھی نشاندہی کرتے ہیں، غور کرتے وقت اس پہلو کو بھی سامنے رکھنے میں کوئی حرج نہیں، ممکن ہے کہ اس سے مسئلہ کو سمجھنے اور حل

کرنے میں مدد مل سکے، وہ یہ کہ حکومت کی طرف سے دی جانے والی رقم (اسکا نام یا عنوان خواہ جو کچھ بھی اختیار کیا جائے) کیا واقعی قرض ہے اور پھر اس کی مع شئ زائد ادائیگی کیا قرضہ مع سود کی واپسی ہے؟ یا وہ اصلا امداد ہے، جسے مختلف مصالح کی بنا پر قرض کا نام دے دیا گیا ہے؟ اور اس کی واپسی کے وقت "انٹرسٹ" کے نام سے معمولی اضافہ کی شرط بھی مصلحۃً ہی لگا دی گئی ہے؟

مثلاً ایک مصلحت یہ ہوسکتی ہے کہ محض "امداد" کے عنوان سے کسی کو کچھ دینا نفسیاتی طور پر جو اثرات مرتب کرتا ہے، قرض کے وہ اثرات نہیں ہوتے، اسی طرح امدادی رقم کی واپسی کے وقت برائے نام اضافہ کی شرط لگانے کا ایک سبب بلاضرورت قرض لینے والوں کی حوصلہ شکنی کرنا ہوسکتا ہے، دوسرا سبب جو نسبۃً اہم ہے، اس سلسلہ کے اخراجات پورا کرنا۔ کیونکہ آج کل کے نظامہائے حکومت میں اہل ملک کو ضروریات زندگی فراہم کرنے بلکہ اب تو معیار زندگی بلند کرنے کے لئے بھی قرضہ دینا ریاست کی ذمہ داری اور اس کے اہم مقاصد میں ہے، یہ ظاہر ہے کہ اس کے نظم اور اس سلسلہ کے دوسرے کاموں پر اخراجات کا ہونا ناگزیر ہے۔

علاوہ ازیں یہ کہ حکومت، نہ صرف انٹرسٹ کے نام پر وصول کی گئی رقم بلکہ رأس المال بھی دوسرے ضرورت مندوں کو امداد محض کے طور پر دیتی ہے یا ان کو قرض دینے میں لگا دیتی ہے، نیز اس کے علاوہ دیگر مختلف رفاہی کاموں میں صرف کرتی ہے جس کا فائدہ "سود" دینے والے کو بھی بالواسطہ یا بلا واسطہ پہونچتا ہے، اس طرح یہ زائد رقم گویا اسے واپس ہوجاتی ہے اور "حق بحقدار رسید" کی مثل صادق آجاتی ہے۔

(مسئلہ کے اسی پہلو کی تفصیل - سوالنامہ کے ہمراہ بھیجے گئے "ضمیمہ" کے ذریعہ آپ حضرات کو معلوم ہو ہی گئی ہوگی) بہرحال اگر علمی و فقہی بنیادوں پر اس پہلو کا استوار کیا جانا ممکن ہو اس طور پر کہ اس کے نتیجہ میں قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے نصاً یا اجتہاداً "ربو" کا جو مصداق معلوم ہوتا ہے، یہ صورت اس سے خارج ہوجائے تو فبہا و نعمت۔

یہاں اس گوشہ پر بھی نظر رہنی چاہئے کہ آج کل کے رائج اقتصادی نظام کے اثر سے زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں کہ جو متأثر نہ ہو، تو کیا اس ابتلائے عام کی بناء پر ''عموم بلوی'' جیسی دلیل بھی کارآمد ہوسکتی ہے؟

معزز حضرات!

آپ کے نہایت قیمتی وقت کا معتد بہ حصہ میں نے لے لیا جس کے لئے معذرت خواہ ہوں، اوراب زیادہ دیر تک کچھ کہتے رہنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، بس آخر میں حضرت تھانوی قدس سرہ جن کی فقہی بصیرت اور دقت نظر مسلم ہے، ان کے الفاظ میں ایک اہم اصولی بات کا پیش کردینا مناسب بلکہ ضروری محسوس کرتا ہوں، تاکہ اس جیسے تمام مسائل حل کرتے وقت اسے راہنما بنایا جاسکے، حضرت موصوف فرماتے ہیں:

> ''ضرورت کی عرفی دو قسمیں ہیں: ایک تحصیل منفعت۔ خواہ دینی ہو یا دنیوی، خواہ اپنی ہو یا غیر کی۔ دوسری دفع مضرت۔ اسی تعمیم کے ساتھ۔ سو تحصیل منفعت کے لئے ایسے افعال کی اجازت نہیں، مثلاً محض تحصیل قوت ولذت کے لئے دوائے حرام کا استعمال، اور دفع مضرت کے لئے اجازت ہے، جبکہ وہ قواعد صحیحہ منصوصہ یا اجتہادیہ سے مفید بہا ہو، اور شرعی ضرورت یہی ہے، مثلاً دفع مرض کے لئے دوائے حرام کا استعمال جبکہ دوسری دوا کا نافع نہ ہونا تجربہ سے ثابت ہوگیا ہو، کیونکہ بدون اس کے ضرورت ہی کا تحقق نہیں ہوتا''۔ (بوادر النوادر۔ ص ۷۹۶)

حضرات کرام! سراپا سپاس ہوں کہ آپ نے میری گذارشوں کو توجہ سے سنا، امید ہے کہ فیصلہ کن راہنمائی فرما کر مزید شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں گے۔(۱) ☆☆☆

(۱) یہ خطبہ مجلس تحقیقات شرعیہ کے جلسہ منعقدہ ۱۵ رمئی ۱۹۷۱ء میں پڑھا گیا، اور تسمیہ، خیر مقدی کلمات اور چند تمہیدی جملوں کے حذف کے ساتھ پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' کے ۲۵ رمئی ۱۹۷۱ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے، اسی کو میں نے اصل قرار دے کر اصل مسودہ سے مطابقت کی ہے۔ (رحمت اللہ)

حکومت سے سود پر قرض لینے کا مسئلہ ☆

تمہید

اس زمانہ میں حکومتیں اپنے شہریوں کی امداد کی خاطر انھیں قرضے بھی دیتی ہیں۔ ہندوستان میں بھی ریاستی ومرکزی حکومتیں اس پر کاربند ہیں، اس قرض کے دو مقصد ہیں:

☆ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (پ: ۱۹۱۴- ت: ۱۹۹۹ء) عالمی شہرت یافتہ شخصیت، داعی، ادیب، مفکر، مؤرخ، مفسر اور محدث، اللہ تعالیٰ نے بے حد مقبولیت ومحبوبیت سے نوازا تھا، جس کی نظیر بڑی مشکل سے ملے گی، زندگی ہی میں کئی کتابیں آپ کی سوانح اور حالات زندگی پر آگئی تھیں، اور وفات کے بعد تو عربی واردو میں ایک درجن سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں، اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے، ۶ رمحرم الحرام ۱۳۳۲ھ مطابق ۵ ردسمبر ۱۹۱۳ء میں دائرہ شاہ علم اللہ، تکیہ کلاں رائے بریلی میں پیدا ہوئے، قرآن پاک ناظرہ اور اردو اور فارسی کی ابتدائی کتابیں اپنی والدہ صاحبہ کی نگرانی میں پڑھیں، ۹ رسال کی عمر میں والد محترم علامہ سید عبدالحی حسنی کے انتقال کے بعد تمام تر تعلیم وتربیت ان کی والدہ محترمہ اور بڑے بھائی مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کی سرپرستی میں انجام پائی، تعلیم کے دوران مولانا نے حدیث، تفسیر اور ادب کے علوم کی تحصیل میں خصوصی دلچسپی لی، عربی ادب میں ان کے دو اہم استاد رہے: ایک شیخ خلیل عرب یمانی، دوسرے شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی، اردو ادب میں اپنے خاندان کے بعض محترم بزرگوں بالخصوص مولانا ابوالخیر صاحب برقؔ سے استفادہ کیا، ۱۹۲۷ء میں لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی میں داخل ہوئے اور عربی زبان وادب کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۲۸ء-۱۹۳۰ء کے عرصہ میں انگریزی زبان کی استعداد بہم پہنچائی، ۱۹۲۹ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور مختلف علوم وفنون کی تحصیل کے مراحل طے کئے، حدیث شریف کی تعلیم ندوہ کے شیخ الحدیث مولانا حیدر حسن خان ٹونکی سے حاصل کی، ۱۹۳۲ء میں مزید استفادہ کے لئے کئی ماہ دارالعلوم دیوبند میں قیام فرمایا اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے بخاری شریف اور ترمذی شریف پڑھی، فقہ میں شیخ الادب والفقہ مولانا محمد اعزاز علی سے استفادہ کیا اور حفص کی روایت کے مطابق قاری اصغر علی سے فن تجوید میں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

اول: افراد اور املاک کی ترقی اور انھیں زوال سے محفوظ رکھنا۔

دوم: شہریوں کی امداد کر کے ان کی بعض پریشانیوں کو دور کرنا۔

ان کلی مقاصد کے پیش نظر حکومت درج ذیل حضرات کو قرض دیتی ہے۔

الف: جو لوگ کاشت کرنے یا باغ لگانے یا اسے آئندہ ترقی دینے کے مقصد سے قرض کے طلبگار ہوں۔

ب: جو لوگ کوئی صنعت شروع کرنا چاہیں یا اپنے کسی مفید صنعتی کاروبار کو ترقی دینا چاہیں۔

ج: بے گھر افراد جنھیں اپنی رہائش کے لئے مکان بنانا ہو اور استطاعت نہ رکھنے کی وجہ سے اس سے قاصر ہوں۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) فائدہ اٹھایا، تفسیر اپنے عہد کے مشہور صاحب طرز استاذ تفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری سے لاہور جا کر پڑھی۔

۱۹۳۴ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں تفسیر وحدیث وادب کے استاد مقرر ہوئے، ۱۹۳۹ء میں پورے برصغیر کا دورہ کیا اور اسلام کی دعوت اور اسلام کے فروغ کے سلسلہ میں کام کرنے والوں کے متعلق معلومات حاصل کی، حضرت مولانا الیاس کاندھلوی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی اور اپنے دور کے دیگر اکابرین سے خاص تعلق تھا، حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری سے اصلاح باطن اور تزکیہ کا خصوصی تعلق تھا اور ان سے ہی اجازت وخلافت حاصل تھی۔

چھوٹی بڑی عرب تالیفات کی تعداد ۱۹۹، اور اردو تصنیفات کی تعداد ۳۰۴ ہے، جن میں ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' اور ''الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکرۃ الغربیۃ'' اور اردو میں ''سیرت سید احمد شہید''، نبی رحمت، تاریخ دعوت وعزیمت (۵ جلدیں) کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، تمام بلاد عربیہ اور یورپ وامریکہ کے اسفار کئے، ہندوستان اور بیرون ممالک کے ادروں اور تنظیموں کے اہم عہدے پر فائز رہے، مثلا: ناظم ندوۃ العلماء، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ، رکن تاسیسی رابطۂ عالم اسلامی مکہ مکرمہ، ناظم وبانی مجلس تحقیقات شرعیہ، صدر دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش، صدر دار المصنفین اکیڈمی، اعظم گڈھ، وغیرہ۔

۱۹۸۰ء میں فیصل ایوارڈ برائے اسلامی خدمات، اور ممتاز اسلامی شخصیت دبئی ایوارڈ سے سرفراز کئے گئے۔

(تفصیل کے لئے پس مرگ زندہ ص ۵۲۴-تا ۵۶۲)، ودیگر کتب ملاحظہ فرمائیں)۔

مندرجہ بالا اقسام کے افراد کو حکومت ان کی امداد واعانت کی غرض سے قرض دیتی ہے مگر اس پر سود بھی لیتی ہے، جس کی شرح مختلف حالات میں مختلف ہوتی ہے، یعنی کبھی پانچ فی صد، کبھی چار فی صد، وعلی ہذا القیاس بعض صورتوں میں سود در سود بھی لگایا جا سکتا ہے۔ نیز سود کی کمی وبیشی نیز قرضخواہ کی اہلیت استقراض کا تعین محض خاص ضوابط کے تحت ہوتا ہے جس کی کچھ تفصیل اس سوالنامہ کے ساتھ ملحق ''ضمیمہ'' سے معلوم کی جا سکتی ہے۔

سود سے جو رقم حکومت کو حاصل ہوتی ہے وہ اس میں سے کچھ حصہ سے ان قرضوں کے سلسلہ کے اخراجات پورے کرتی ہے اور بقیہ رقم اپنی صوابدید کے مطابق مفاد عامہ کے نام پر خرچ کرتی ہے یا دوسروں کو قرض دے کر مزید فائدہ حاصل کرتی اور فائدہ پہونچاتی ہے۔

قرض لینے کے اسباب ودواعی

جن اسباب ودواعی کی بنا پر قرضے لئے جاتے ہیں ان کا وجود مسلمانوں میں بھی ہے بلکہ درحقیقت ان میں غربت وافلاس کی وجہ سے وہ اسباب زیادہ موجود ہیں، ان اسباب کی تفصیل درج ذیل ہے:

الف: جن لوگوں کا پیشہ کاشتکاری یا باغ کی پرورش ہے، کبھی ان کے پاس زمین ہوتی ہے لیکن بوجہ افلاس اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے، اس لئے عسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں، اگر وہ حکومت سے قرض لے کر زمین پر لگائیں تو اس سے فائدہ اٹھا کر آرام سے زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

ب: بعض لوگوں میں کسی صنعتی کاروبار کو چلانے کی صلاحیت ہوتی ہے لیکن قلت سرمایہ کی وجہ سے اس مقصد کو حاصل نہیں کر سکتے اور اچھی استعداد اور صلاحیت کے باوجود افلاس کی زندگی گذارتے ہیں، اگر وہ حکومت سے قرض لے کر کاروبار جاری کر دیں تو ان کی زبوں حالی دور ہو جائے، اور اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے وہ کافی ترقی کر سکیں گے۔

ج: بعض مسلمانوں کو کاروبار یا زراعت وصنعت میں کسی غلطی یا اتفاقی حادثہ کی وجہ سے ایسا نقصان پہونچ جاتا ہے جس کی بنا پر وہ تنگدستی میں مبتلا ہوجاتے ہیں اگر وہ اس کاروبار یا زراعت یا صنعت کا سلسلہ ختم کردیں تو فاقہ کشی تک نوبت پہونچ جائے اور اگر اس سلسلہ کو جاری رکھیں تو اس کے لئے سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ بلاسود قرضہ ملنا تقریبا محال ہے، عام سود خواروں سے قرض لینے میں خطرات بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ اور شرح سود بھی ان کے یہاں زیادہ ہوتی ہے، اس لئے حکومت سے قرض لینا ان کے لئے ہر طرح کفایت وعافیت کا باعث ہوسکتا ہے۔

د: صوبۂ یوپی کا قانون یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی قابل کاشت زمین کو تین سال تک بیکار رکھے اور اس میں زراعت نہ کرے، نہ مزارعت پر کسی کو دے تو گاؤں کی پنچایت اس زمین پر قبضہ کرنے کی مجاز ہے اور وہ جسے چاہے اسے مزارعت پر دے سکتی ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ پھر وہ زمین اس مالک کے قبضہ سے عملا نکل جاتی ہے۔ ایسی حالت میں وہ لوگ جن کے پاس خاصی زمین ہے مگر سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے اس سے فائدہ اٹھانے سے قاصر ہیں دوسری طرف بعض قوانین نیز لوگوں میں بدمعاملگی کا رواج ہونے کی وجہ سے کسی کو مزارعت پر دینے میں زوال ملک یا زوال قبضہ کا خطرہ محسوس کرتے ہیں اگر حکومت سے قرض لے کر زمین سے فائدہ اٹھائیں تو اس نقصان سے محفوظ ہوسکتے ہیں۔ اور مرفہ الحال بن سکتے ہیں۔

ہ: شہروں میں مکانات کی قلت ایک معروف واقعہ ہے۔ بکثرت اوسط درجہ کے مسلمان کرایہ کے مکانوں میں رہتے ہیں اور اپنی حیثیت سے زائد کرایہ ادا کرتے ہیں، ان کی آمدنی میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ پس انداز کرکے مکان بنالیں۔ اگر کوئی گنجائش نکلتی بھی ہے تو اس کے لئے معتد بہ رقم جمع کرنے کے لئے طویل مدت درکار ہوتی ہے، اس میں اندیشہ ہوتا ہے شاید عمر وفا نہ کرے، اگر یہ لوگ حکومت

سے قرض لے کر مکان تعمیر کرلیں تو کرایہ کی رقم بچ جائے اور سود اس سے کم ہوگا، اس طرح انہیں بچت بھی ہوگی، اور مکان بھی میسر ہوجائے گا۔

و: افراد سے قوم بنتی ہے، اگر ان قرضوں کو لے کر مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد نے مالی ترقی کی یا کم از کم تنزل سے بچ گئی تو اس کا اثر پوری قوم کے وقار پر پڑے گا، اور اگر مسلمان اس بارے میں دوسری قوموں سے پیچھے رہ گئے اور ان کی مالی حالت کمزور ہوتی رہی تو ان کا قومی وقار روز بروز کم ہوتا چلا جائے گا، حتی کی اندیشہ ہے کہ کسی دن وہ اچھوتوں کے درجہ پر آ جائیں گے، اس وقت ہندوستان کی دوسری قومیں حکومت سے قرض لے کر صنعتی اور زراعتی ترقی کررہی ہیں، مسلمانوں کا اس میں پیچھے رہ جانا ان کے لئے خطرناک ہے۔

ز: تجارت یا صنعت، یا زراعت میں مسلمانوں کی ترقی وتنزلی کا اثر ان کے دینی وقومی اداروں پر بھی پڑتا ہے کیونکہ ان ہی کی امداد سے یہ ادارے چلتے ہیں۔

نقصانات وخدشات

ساتھ ہی حکومت سے سودی قرض لینے کے مضر پہلو کی طرف بھی توجہ کرنا ضروری ہے۔

الف: ایسے اتفاقات پیش آسکتے ہیں اور آجاتے ہیں کہ مزید سرمایہ لگانے کے بعد بھی کاروبار میں تنزل اور انحطاط بھی ہوتا رہتا ہے۔ بعض اوقات مکان تعمیر ہوجانے کے بعد کسی سبب سے آمدنی کم ہوجاتی ہے یا خرچ میں اضافہ ہوجاتا ہے ایسی صورت میں تو اصل کیا، سود ادا کرنا بھی مشکل ہوجاتا ہے، پھر چونکہ یہ قرض حکومت کا ہوتا ہے اس میں مال کے ساتھ آبرو جانے کا بھی خطرہ ہے، اور قید وبند کی نوبت آجاتی ہے۔

ب: اگر اہل علم کی طرف سے سودی قرضہ کے لینے کی اجازت مل جائے تو مسلمانوں کا سود کی حرمت کے بارے میں جو ذہن بنا ہوا ہے بدل جائے گا، ''ربوا'' کی شناعت

ان کے ذہن میں اس درجہ باقی نہیں رہے گی، جواب تک باقی ہے، اور جو باقی رہنی چاہئے۔ اور اس حقیقت کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے کہ جس زمانہ میں ''ربوا'' کی حرمت نازل ہوئی تھی مسلمانوں کی مالی حالت اب سے کہیں زیادہ خراب تھی، اور اقتصادی اعتبار سے وہ کافی زبوں حال تھے۔

سود اور ٹیکس

ٹیکس یا کسی اور نام سے حکومت کے خزانہ میں جو روپیہ عام شہریوں سے وصول کر کے داخل کیا جاتا ہے، وہ کسی فرد خاص کی ملک نہیں ہوتا، بلکہ بحیثیت مجموعی وہ تمام شہریوں کی ملک بتایا جاتا ہے، یعنی اسے ملک عام سمجھا جاتا ہے، نہ کہ ملک خاص، اس کا صرف بھی اصولا عام ہوتا ہے، یعنی اسے مفاد عامہ کے لئے خرچ کیا جاتا ہے، اور قرضدار بھی اس سے بالواسطہ یا بلا واسطہ مستفید ہوسکتا ہے، مثلا سود ہی کی رقم ہے، اگر اسے حکومت کسی صنعتی ترقی میں لگاتی ہے، تو اس سے بعض مصنوعات کی ارزانی یا سہولت حاصل ہوسکنے کا فائدہ ہوتا ہے جو بسا اوقات اس قرضدار کو بھی پہنچتا ہے جس نے حکومت کو سود ادا کیا ہے۔

مفاد عامہ میں صرف کرنے کے لئے حکومت سود کے علاوہ کچھ رقم مملکت کے شہریوں سے وصول کرتی ہے جسے ''ٹیکس یا محصول'' کہتے ہیں، اس کی مختلف شکلیں ہیں از انجملہ انکم ٹیکس ہے، یعنی آمدنی کا ایک معیار مقرر کردیا گیا ہے، جب کسی شہری کی آمدنی اس معیار کے مطابق ہوگی تو اس سے خاص شرح کے مطابق ٹیکس لیا جائے گا، نیز بعض املاک پر بھی ٹیکس لگائے جاتے ہیں، معاشیات میں ٹیکس کی تعریف یہ ہے:

> ''ٹیکس سے مراد دولت کا وہ حصہ ہے جو لوگ غیر اختیاری طور پر سرکار کو مصارف حکومت کے واسطے ادا کریں''۔ (اصول معاشیات حصہ سوم باب ۱۸/ص ۲۹۶ از پروفیسر محمد الیاس برنی مرحوم)

اور غیر اختیاری کی وضاحت مصنف موصوف نے یہ کی ہے:

> ''غیر اختیاری طور سے مراد خواہ مخواہ جبر یا اکراہ نہیں ہے، بلکہ اس واقعہ کا اظہار ہے کہ ٹیکس کی مقدار اور طریق ووقت ادائی سرکار خود مقرر کرتی ہے'' (کتاب مذکور: ص ۲۹۷)

ٹیکس کی اس تعریف کی بناء پر ایک خیال یہ ہے کہ قرضداروں سے جو رقم حکومت سود Intrest کے نام سے وصول کرتی ہے چونکہ وہ کسی انفرادی نفع کے لئے نہیں لیتی بلکہ مفاد عامہ یا بہ الفاظ دیگر مصارف حکومت کے لئے لیتی ہے، لہذا وہ ٹیکس کے ہی حکم میں ہے۔

سوالات

اب حضرات علمائے کرام کی خدمت میں مؤدبانہ گذارش ہے کہ مندرجہ ذیل سوالات کے مدلل جوابات عنایت فرمائیں۔

(۱) اگر اس سود پر جسے حکومت اپنے کسی شہری کو قرض دے کر حاصل کرتی ہے ٹیکس کی تعریف صادق آتی ہے، کیونکہ اس کی ملک بھی عام ہوتی ہے اور اس کا مصرف بھی عام ہوتا ہے، تو کیا محض اس وجہ سے کہ اسے سود (Intrest) کہتی ہے، اسے ربوا شرعی قرار دے کر حرام اور اس کی وجہ سے قرض مذکور لینے کو بھی حرام سمجھا جائے گا، یا اسے بھی ٹیکس ہی کی ایک شکل سمجھ کر اس کی ادائیگی کو جائز اور ایسے قرض لینے کو مباح قرار دیا جاسکتا ہے؟

(۲) والی یا حاکم عام کو رعیہ کے اموال پر بعض تصرفات کے جو خصوصی حقوق حاصل ہیں آیا سودی قرضہ کو ان میں شامل کر کے کوئی جواز کی گنجائش نکل سکتی ہے؟

(۳) اگر یہ سود کی رقم ربوا شرعی ہے تو کیا تمہید میں ذکر کردہ مصالح اور اسباب ودواعی کو ''ضرورت یا حاجت'' قرار دیا جاسکتا ہے جس کی بناء پر حکومت سے ایسے قرضے لینے کو جائز قرار دیا جاسکے؟ ''**فإن الضرورات تبيح المحظورات**''۔

(۴) ایسے مقامات جہاں اقتدار اعلی مسلمانوں کو حاصل ہے اور بلا سودی قرض کا نظام جاری کرنا ان کے اختیار میں ہے اور ایسے مقامات کے درمیان جہاں قوانین کو کلیۃ

شریعت کے مطابق نہیں بنایا جاسکتا، اور مسلمان اپنے اختیار سے غیر سودی نظام نافذ نہیں کرسکتے، کوئی فرق ہوگا یا نہیں؟ اگر ہوگا تو کیا؟

والسلام

ابوالحسن علی ندوی

صدر مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء، لکھنؤ

☆☆☆☆

صارفین کے لئے قرضوں کی نوعیت ☆

آج کل کی حکومتیں کن مقاصد کے لئے اور کس طرح افراد کو قرض دیتی ہیں؟ اس کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ مالیات عامہ اور اس کے طریقۂ کار پر ایک طائرانہ نظر ڈالی

☆ یہ مقالہ بہت اہم اور مفید ہے اگر چہ بظاہر یہ تحریر نامکمل ہے مگر اتنا حصہ ہی محفوظ ہے، افسوس کہ مقالہ نگار کا نام درج نہ تھا۔ البتہ مجلس تحقیقات شرعیہ کی مختصر تاریخ سے معلوم ہوا کہ یہ وضاحتی اور تفصیلی تحریر مجلس کے ناظم مولانا محمد اسحٰق سندیلوی ندویؒ کی ہے۔

مولانا محمد اسحٰق صدیقی سندیلوی ندوی (پ: ۱۹۱۳ء ہند- ت: ۱۹۹۵ء کراچی) مرحوم برصغیر ہندو پاک کے مشہور ومعروف مفکر، محقق، مصنف اور محدث وفقیہ تھے، ۱۲/فروری ۱۹۱۳ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے، ان کے والد ماجد لکھنؤ سے ۵۴ کلو میٹر مغرب میں واقع شہر سندیلہ کے ایک معزز صدیقی خاندان کے صاحب حیثیت اور باوقار فرد تھے۔

مولانا مرحوم نے مدرسہ عالیہ فرقانیہ لکھنؤ، اور دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم حاصل کی اور کم وبیش ۲۲/سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے، آپ کی شخصیت بڑی جاذب نظر، پرکشش، دل آویز اور دل نواز تھی، دینی وعصری تعلیم کے حصول کے بعد ۱۹۳۵ء میں دارالعلوم کے استاد مقرر ہوئے، آپ کی ذات بڑی جامع الصفات والکمالات تھی، آپ بیک وقت مسجد کے امام وخطیب، دارالاقامہ کے اتالیق اور ہومیوپتھ کے حاذق طبیب تھے، دارالافتاء کے ذمہ دار اور شیخ الحدیث تھے، تقریباً ۳۴/سال مختلف حیثیتوں سے ندوہ سے وابستہ رہ کر اہتمام سے سبکدوش ہوگئے، اور ۱۹۷۰ء میں پاکستان چلے گئے، ندوہ میں ہر فن کی کتابیں پڑھائیں، اردو، عربی، انگریزی میں یکساں مہارت رکھتے تھے، علم میں پختگی اور رسوخ تھا تحریر وتالیف کا بڑا صاف ستھرا، تحقیقی اور اعلیٰ ذوق تھا، ۱۹۴۰ء میں ''اسلام کا سیاسی نظام'' جیسی معرکۃ الآراء کتاب تالیف فرمائی۔

ستمبر ۱۹۶۳ء میں ''مجلس تحقیقات شرعیہ'' کا قیام عمل میں آیا تو مولانا سندیلوی رکن نامزد ہوئے، اور ۱۹۶۴ء میں مجلس کے ناظم اول مولانا تقی امینی کے علی گڈھ منتقل ہوجانے کے بعد مجلس کے ناظم مقرر ہوئے، آپ نے اپنے تحقیقی ذوق، وسعت مطالعہ اور جدوجہد سے اس مبارک تخم کو شجر سایہ دار بنا کر اہل علم میں متعارف کرایا، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جائے، پچھلے زمانہ میں حکومتوں کے فرائض لوگوں کے جان ومال کی حفاظت، ملک کو حملہ آوروں سے محفوظ رکھنے اور رفاہ عامہ تک محدود تھے۔اب ان فرائض کے ساتھ ساتھ ہر حکومت خواہ وہ جمہوریت ہو یا شخصی حکومت، آمرانہ ہو یا اشتراکی اس کی مدعی ہے کہ اس کا مقصد عوام کا معیار زندگی بلند کرنا اور ان کے لئے بہتر اور متنوع زندگی کے مواقع فراہم کرنا ہے،اس مقصد کے حصول کے لئے حکومتیں ملک کے تمام انسانی اور مادی ذرائع کو زیادہ مؤثر طریقہ پر استعمال کرنے کی کوشش کرتی ہیں تا کہ ان سے حاصل شدہ اشیاء اور خدمات کو ملک کی بہتری کے کام میں لایا جاسکے۔آمدنی، دولت اور مواقع میں نابرابری کو کم کیا جاسکے،یعنی تمام مادی وسائل کو اسی طرح کام میں لایا جائے کہ پیداوار کو بڑھا کر ملک کی مجموعی دولت کو فوری طور پر بڑھایا جاسکے اور مختلف طبقات میں نابرابری کو کم کیا جاسکے۔گویا کہ مالیات عامہ کا مقصد صرف ملک کی مالیات کا انتظام ہی نہیں بلکہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کے سماجی اور اقتصادی ڈھانچے کے اندر اقتصادی سرگرمی کو اس طرح ابھارا جائے کہ ملک میں دولت کی افزائش کے ساتھ تمام افراد کو روزگار مل سکے،تعلیم کا انتظام کیا جاسکے، انھیں بیماریوں اور دوسری مجبوریوں سے بچایا جاسکے،اوران کے لئے مناسب آمدنی کی صورت پیدا ہو۔

کسی ملک کی پیداوار کا معیار اور مادی بہبود کا انحصار اس سرمائے پر ہوتا ہے جو اس کے پاس ہو،سرمائے سے مراد ہے زمین، فیکٹریاں، ریلوے مشینری، آبپاشی کی صورت، بجلی گھر اور ذرائع رسل ورسائل کی صورت میں، پیداوار کا ساز وسامان اور اس کے ساتھ اسے بہترین طریقہ پر استعمال کرنے کا علم اشیاء پیداوار اور خدمات میں اضافے کا باعث ہوتا ہے اور اس سے ملک کی مادی بہبود کا معیار بلند ہوتا ہے، اسے دوسرے الفاظ میں یوں

(گذشتہ صفحہ کا بقیہ) ۱۹۶۵ء میں شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوئے، پھر مہتمم ہوئے، آپ مولانا شاہ وصی اللہ الہ آبادی اور ڈاکٹر محمد عبدالحی عارفی کے خلیفہ تھے، پاکستان منتقل ہونے کے بعد علامہ محمد یوسف بنوری کی خواہش پر ان کے ادارہ جامعۃ العلوم الاسلامیہ کراچی سے وابستہ ہوگئے، تخصص فی الفقہ کے نگراں، شعبہ دعوت وارشاد کے صدر اور مجلس دعوت وتحقیق کے رکن منتخب ہوئے، پھر مفتی طاہر مکی کے ادارے مدینۃ العلوم کے صدر مفتی مقرر ہوئے، اور آخر تک اپنی خدمات یہیں انجام دیتے رہے، ۲۲/اکتوبر ۱۹۹۵ء کو وفات ہوئی، اور کراچی کے قبرستان میں مدفون ہوئے، اللہم اغفرلہ وارحمہ۔

کہہ سکتے ہیں کہ اقتصادی ترقی کا راز سرمائے کی تنظیم اور اس کے بہتر استعمال میں مضمر ہے۔ چونکہ حکومت ایک بامقصد ادارہ ہے لہذا اس کے اخراجات کا تعین بڑی حد تک اس کے مقاصد کرتے ہیں۔حکومت کو اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے وسیع وسائل کی ضرورت پڑتی ہے،ان اخراجات میں سے تحفظ عامہ،تعلیم وصحت پر ہونے والا خرچ اور اسی قسم کے دوسرے اخراجات جن کی ضرورت متواتر پڑتی رہتی ہے،محاصل سے پورے کئے جاتے ہیں جس کے لئے حکومتیں مختلف اوقات میں ٹیکس یا محاصل کی شرح مقرر کرتی رہتی ہیں لیکن ملک کی معاشی تعمیر وترقی کے لئے جس قسم کے بڑے کاموں کو انجام دینا ہوتا ہے ان کے لئے وسیع مالی وسائل کی ضرورت ہوتی ہے اور ان کو صرف محصول عائد کر کے نہیں فراہم کیا جاسکتا۔اس میں شک نہیں کہ محاصل ان وسائل کی فراہمی کے لئے مددگار ہوتے ہیں لیکن ان سے ضرورت پوری نہیں ہوسکتی، تیسری اور اہم ضرورت جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے، وہ معاشرے کی اجتماعی ضرورت کی تکمیل ہے،اس میں اصل اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ عوامل پیداوار مثلا زمین، محنت، مشینوں وغیرہ کو اشیاء صرف (Consumer Goods) کی پیداوار سے فارغ کر کے سامان سرمایہ (Capital Goods) پیدا کرنے اور ایسی صنعتوں میں لگایا جائے جن کو آئندہ مزید سامان پیدا کرنے کے لئے کام میں لایا جاسکے۔

سرمایہ کا خرچ

ظاہر ہے کہ اس قسم کی ضرورت کے لئے زمانۂ جنگ میں دفاع پر غیر معمولی اخراجات کے لئے محاصل کی آمدنی ناکافی ہوگی اور ان صورتوں میں عوام سے مزید مالی تعاون کی ضرورت ناگزیر ہوجائے گی، اس قسم کی ضروریات کو ٹیکس اور محاصل میں اضافہ کے بجائے عوام سے قرض لے کر پورا کیا جاتا ہے۔فی نفسہ ٹیکس اور قرض میں زیادہ فرق نہیں ہے،ٹیکس اور قرض دونوں میں حکومت عوام کی بچت کا ایک حصہ ان سے لے کر معاشی تعمیر وترقی میں لگادیتی ہے۔ٹیکس کے ذریعہ چونکہ عوام کو اپنے صرفہ میں کمی کر کے بچت

حکومت کے حوالہ کرنا ہوتی ہے لہذا یہ ایک حد سے زیادہ نہیں بڑھائی جاسکتی جبکہ قرض کے ذریعہ یہ بار آنے والی نسلوں پر بھی بٹ جاتا ہے۔

حکومت کے ایسے بڑے اخراجات کو جو معاشی ترقی کے لئے ناگزیر ہیں، حاصل کرنے کے لئے مندرجہ ذیل طریقوں سے سرمایہ حاصل کیا جاتا ہے:

(۱) قرض- اس میں چھوٹی بچتوں کی اسکیم، بینکوں سے قرض، لمبی مدت کے داخلی قرض، ملازمین کے پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔

(۲) غیر ممالک سے قرض

(۳) خسارے کی مالیات

قرض لینے میں نفع اندوزی کا عنصر

داخلی قرضوں کی معاشی اہمیت بھی ہے کیونکہ جب عوام کے پاس دولت کی افراط ہو تو قیمتوں کے گرنے کا اندیشہ ہوجاتا ہے۔ عوام سے قرض لے کر گویا ان کی ہر آمدنی کا ایک حصہ ان کے ہاتھوں سے واپس لے کر حکومت طلب مؤثر (Effective Demand) کو کم کردیتی ہے جس کی وجہ سے افراط زر پر قابو حاصل کرلیا جاتا ہے۔

ان قرضہ جات کے ذریعہ حکومت سرکاری زمرے میں جو پیداوارانہ ذرائع تخلیق کرتی ہے، ان کی مدد سے قرضوں کا سودا کیا جاتا ہے آئندہ لئے جانے والے قرضوں سے اصل کی واپسی کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس سے یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ حکومتی قرضوں کا منشاء ومقصد صرف منفعت حاصل کرنا ہے۔ کیونکہ قومی یا سرکاری زمرے کی بعض بڑی صنعتیں آب پاشی کی اسکیمیں نقل وحمل اور رسل ورسائل کا انتظام اور دفاع سے تعلق رکھنے والی صنعتیں قرضہ جات سے حاصل شدہ سرمایہ سے ہی چلائی جاتی ہیں، ان میں سے بعض میں بہت کم یا بالکل نفع نہیں ہوتا اور اکثر اوقات انھیں عوام کے مفاد میں نقصان پر بھی چلانا پڑتا ہے۔ اس لئے سرکاری قرضہ جات کی وصولی اور اس کے استعمال میں نفع کو ہمیشہ نظر میں رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔

خسارے کی مالیات

چونکہ افراد کو دئے جانے والے قرضوں کو سرمایہ کے اسی مد سے پورا کیا جاتا ہے جس کا ایک جز خسارے کی مالیات یا نئے زر کی تخلیق بھی ہے، لہذا اسے بھی یہاں مختصراً بیان کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جب حکومت کا خرچ محاصل کی آمدنی اور اس کو ملنے والے قرض سے بڑھ جاتا ہے تو اس کمی کو نئے زر کی تخلیق کے ذریعہ پورا کیا جاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں قومی معیشت میں زر کی رسد میں جو اضافہ ہوتا ہے اس کے سبب اشیاء کے نرخ گراں ہوجاتے ہیں، دوسرے لفظوں میں زر کی زیادتی اور موجود اشیاء کی مقدار میں کوئی اضانہ نہ ہونے کی وجہ سے زر کی قوت خرید میں کمی آجاتی ہے، خسارے کی مالیات کا اثر عوام پر ایک مثل محصول کا ہوتا ہے جس کا بار امیر غریب سب پر یکساں پڑتا ہے۔

افراد کو حکومت کی جانب سے دئے جانے والے قرض

جیسا کہ اوپر بتایا جاچکا ہے حکومت سرکاری زمرے کی صنعتوں کو چلانے یا اس قسم کی پیداوارانہ صلاحیت حاصل کرنے کے لئے کہ جس سے اس کو نفع ہو، قرض لیتی ہے، اس سرمایہ سے حکومت سماج کے ایسے افراد کو جن کو وہ امداد کا مستحق سمجھتی ہے، کاروبار چلانے یا انھیں معاشرے کے لئے زیادہ کارآمد بنانے کے لئے قرض دیتی ہے، ان حاجتمند افراد میں سے ایسے لوگ جو بالکل پیداواری صلاحیت سے محروم ہوتے ہیں مثلاً فقیر، اپاہج، طالب علم انھیں قرض کے بجائے امداد، وظائف یا ان کے رہن سہن کا انتظام کرکے ان کی مدد کی جاتی ہے، اس قسم کی امداد کا تعلق قرض سے نہیں ہوتا بلکہ یہ مدد محاصل کی مد سے کی جاتی ہے لیکن ایسے افراد جو اثاثہ یا ذریعۂ آمدنی رکھتے ہیں یا مناسب ذریعۂ آمدنی نہ ہونے کی وجہ سے معاشرے کی پیداواری صلاحیت بڑھانے سے محروم ہیں انھیں ان کی ضروریات کی تکمیل کے لئے عارضی طور پر قرض دیا جاتا ہے تاکہ وہ مستقبل میں ہونے والی آمدنی سے اسے واپس کرسکیں۔

افراد کو دیئے جانے والے قرضوں کی قسمیں

۱-براہ راست قرض

کفالت عامہ حکومت کے بنیادی فرائض میں شامل ہے اور زیادہ ترقی یافتہ ممالک میں بچوں، بڈھوں اور بیروزگاروں کو وظائف دینے کا رواج ہے لیکن غیر ترقی یافتہ ممالک میں محدود وسائل کی وجہ سے حکومت اس قسم کے بار اٹھانے کے قابل نہیں ہوتی۔ ایسے ممالک میں عام طور پر لوگوں کو روزگار سے لگانے یا ان کی پیداواری صلاحیت بڑھانے کے لئے قرض دینے کا دستور ہے، اس قسم کے قرضہ جات بھی مخصوص مقاصد کے لئے جیسے چھوٹے کاروبار اور کارخانے قائم کرنے، باغات لگانے، کنویں کھودنے، مرغی پالنے یا اس قسم کے دوسرے کام کے لئے دئے جاتے ہیں۔ ان تمام قرضوں میں سود ایک ضروری جز ہوتا ہے کیونکہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس شخص کو قرض دیا جارہا ہے اسے قرض سے حاصل شدہ آمدنی کا ایک حصہ حکومت کو دینا چاہئے۔ اس قسم کے قرض عوام اور ملازمین سبھی کو مناسب ضمانت پر دئے جاتے ہیں۔

۲-حکومت کے ملازمین کو قرض

حکومت یا بڑے ادارے جن کے ملازمین کی تعداد کافی ہوتی ہے، اپنے ملازمین کو ان کی بنیادی ضروریات کو پوری کرنے، بچوں کی شادی و تعلیم، مکان بنانے، سائیکل یا موٹر خریدنے کے لئے قرض دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ قرضوں کی نوعیت تو وہ ہے جو اس سے پہلے بیان کی جاچکی ہے مگر کچھ قرضہ جات ایسے ہیں جو ملازمین کو ان کے پراویڈنٹ فنڈ سے دئے جاتے ہیں۔ ان قرضوں کی نوعیت پہلے مذکور قرض سے قدرے مختلف ہے کیونکہ قرض لینے والا دراصل اس رقم سے قرض لیتا ہے جو اسی کا ہے مگر ملازمت کی شرائط کے بموجب اس کی تنخواہ سے جمع ہوتی رہتی ہے۔ اس قسم کے قرضوں میں بھی سود ایک جزء لاینفک ہے کیونکہ پراویڈنٹ فنڈ میں جو رقم جمع ہوتی ہے اس کو حکومت ایک خاص شرح سے (۵ء۲ فیصد) سود ادا کرتی ہے۔ چونکہ ملازم جس شرح سے سود ادا کرتا ہے وہ اس سے زائد

نہیں ہے جو حکومت ادا کرتی ہے لہذا یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس قرض میں بھی قرض دینے والا (جو ایک طرح سے خود مقروض ہوتا ہے) کے پیش نظر منافع کا عنصر ہوتا ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔

اسی سے ملحق یہ مسئلہ بھی ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کو قرض تصور کر کے حکومت اپنے اختیار سے اسے اپنے نفع آور کاموں میں صرف کر دیتی ہے پھر اس پر بغیر قرض خواہ کی مرضی کا لحاظ کئے ہوئے ایک مقرر شرح پر سود ادا کر دیتی ہے۔ اس میں قابل غور بات یہ ہے کہ اصل پر ایک خاص شرح سے متعین مدت میں اضافہ ہونے کے باوجود قرض خواہ کی نفع کمانے کی خواہش کو کوئی دخل نہیں ہوتا بلکہ قرضدار خود ہی یک طرفہ طور پر طے کرتا ہے کہ اسے کتنا نفع یا سود ادا کرنا ہے۔

۳-امداد باہمی سوسائٹیوں کے ذریعہ قرض

یہ قرض کے اجزا کی تیسری صورت ہے، ترقیاتی مالیات کے نظام میں امداد باہمی کی انجمنوں کو کلیدی اہمیت حاصل ہے، ان انجمنوں کا سرمایہ ممبران کے حصص، بینکوں اور حکومت کی اعانت سے مجتمع کیا جاتا ہے اور پھر اسے حکومت کے مقرر کردہ ضابطہ کے مطابق انجمن کے ممبران کو قرض یا دوسری ایسی سہولتوں کو بہم پہونچانے کے کام میں لایا جاتا ہے جس کا انتظام فرد واحد کے بس میں نہیں ہوتا، اس قسم کی انجمنوں سے اگر ایک طرف اس کے ممبران ذاتی صرف کے لئے رقم قرض لے سکتے ہیں تو کچھ انجمنیں زراعتی یا صنعتی آسانیاں بہم پہونچاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایسی انجمنوں کے ذریعہ کسانوں کو اچھے بیج اور کھاد وغیرہ اور چھوٹی صنعتوں کے لئے خام مال فراہم کیا جاتا ہے مگر اشیاء اور خدمات کی قیمت انجمنوں کو اصل مع سود کی صورت میں ہی ادا کی جاتی ہے۔ بہرحال یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان انجمنوں کا مقصد بھی حصول منافع کے بجائے اپنے ممبروں کی خدمت اور سہولت بہم پہونچانا ہے کیونکہ بسا اوقات ممبروں سے ملنے والے نفع اور سود کے باوجود ان کے اخراجات اور ابتدائی نقصانات کا ایک حصہ حکومت برداشت کرتی ہے۔

۴-(بالاقساط خریداری)

بعض ترقی یافتہ ممالک میں بالاقساط ادائیگی کے وعدہ پر خریداری کا طریقہ رائج ہے۔بعض قسم کے پائدار سامان مثلاً ریڈیو، پنکھے وغیرہ کے سلسلہ میں یہ سہولت ہندوستان میں بھی ملتی ہے۔مگر اس قسم کی خریداری بھی عموماً حکومت کا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا البتہ اس طریقہ پر کسی حد تک حکومت کی شرکت سے صارفین کو قسطوں پر مکان فروخت کرنے کا انتظام کیا جاتا ہے،اس طریقہ میں بھی صارفین کو خرید کردہ اشیاء کی قیمت کے ساتھ سود بھی ادا کرنا ہوتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ کم آمدنی والا طبقہ جو مہنگی ضروریات زندگی کی قیمت بیک وقت نہیں ادا کرسکتا اس طرح ان اشیاء کو حاصل کرسکتا ہے مگر یہ طریقہ سود کو معاشرہ کے زیادہ سے زیادہ افراد پر مسلط کرنے اور ان کی آمدنی کے معتد بہ حصہ کو سود کے ذریعہ سرمایہ دار طبقہ کو منتقل کرنے کا کام بہت بڑے پیمانے پر انجام دے رہا ہے کیونکہ ادھار خریدنے والوں کو بہت بھاری شرح پر سود ادا کرنا پڑتا ہے، بلکہ بعض اوقات تو حساب کتاب پر آنے والی لاگت اور اجرت خدمت کے نام سے خاصی رقم الگ سے دینی پڑتی ہے۔

۵-(مالیاتی ادارے)

نجی زمرے میں چلنے والی صنعتوں، آبپاشی کی اسکیموں، زراعتی ترقی اور اسی قسم کے دوسرے کاموں کے لئے حکومت کی مالیاتی پالیسی کے ماتحت بینک اور انشورنس کی مدد سے ایسے مالیاتی اداروں کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے جو نجی زمرے میں افراد اور اداروں کی مالی ضرورت قرض دے کر پورا کرتے ہیں مثال کے طور پر لینڈ ڈیولپمنٹ بینک (Land Development Bank) کسانوں کی زمین رہن رکھ کر ان کی زرعی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے قرض دیتے ہیں۔اس قسم کے قرضوں میں بھی سود جزء لاینفک ہوتا ہے۔

۶-تجارتی قرض

قرض کی ایک اور اہم شکل جس کا حکومت کی جانب سے یا اس کی شرکت سے دئے جانے والے قرض سے تعلق نہیں ہے مگر جسے تجارت وحرفت میں ایک اہم مقام حاصل

ہے،تجارتی قرض ہے، جسے عام طور پر بینک مہیا کرتے ہیں۔تجارت کے لئے جس قدر سرمائے کی ضرورت ہر تاجر کو پڑتی ہے اس قدر سرمایہ عام طور سے تاجروں کے پاس مختلف وجوہ کی بنا پر موجود نہیں ہوتا، اس لئے انھیں مطلوبہ سرمایہ قرض لینا پڑتا ہے۔ مال دینے والا خریدار کو ادا کردہ قیمت سے زائد مال اس شرط پر دے دیتا ہے کہ مقررہ وقت گذرنے کے بعد اسے اصل مع مقررہ سود کے مل جائے گا۔اکثر یہ کاروبار بینک کے ذریعہ بھی کیا جاتا ہے اور بینک اس قرض کی ادائیگی کی ضمانت لے لیتا ہے۔ یہ قرضے عندالطلب واپسی کے وعدہ پر ایک دن کے لئے، چند دنوں کے لئے یا چند ہفتوں کے لئے حاصل کئے جاتے ہیں اور جن پر طے شدہ شرح کے مطابق سود ادا کرنا ہوتا ہے۔

اس قسم کی ضرورت تجارت کے علاوہ صنعتوں اور زراعت میں بھی پڑتی رہتی ہے۔ تاجر یا صنعت کار اس اعتماد پر اس قسم کے قرض حاصل کرتا ہے کہ وہ اپنے مال کو مقررہ وقت میں فروخت کر کے اس کی آمدنی سے اس قرض لئے ہوئے سرمائے کو مع سود واپس کرسکتا ہے اور عام طور پر ہوتا بھی ایسے ہی ہے کیونکہ اس قسم کے قصیر المیعاد قرضوں کی عام مقبولیت اور چلن اس بات کا ثبوت ہے کہ اس میں خطرات کم اور منافع کی امید پوری ہوتی ہے۔علاوہ بریں اس قسم کے قرضوں کو شرکت یا مضاربت کے اصول پر بھی نہیں حاصل کیا جاسکتا کیونکہ کوئی شخص یا ادارہ اتنے تھوڑے عرصہ کے لئے شرکت پسند نہیں کرے گا۔اور نہ قرض لینے والا ہی یہ چاہے گا، ساتھ ہی ساتھ تھوڑی مدت کیلئے لئے جانے والے قرضوں میں بشکل سود منافع دینا اس وجہ سے بھی زیادہ قابل عمل ہے کہ مختصر مدت کی شرکت میں منافع کا حساب لگانا تقریباً ناممکن ہے۔عملی طور پر یہ اس لین دین کے مثل ہے جس میں ایک شخص بصورت نقد کسی چیز کی جتنی قیمت ادا کرتا ہے ادھار کی صورت میں اس سے کچھ زائد ادا کرتا ہے۔

اوپر صارفین کو دیئے جانے والے قرضوں کی جتنی شکلیں بیان کی گئی ہیں ان میں سے ہر ایک میں:

(الف) اصل کے ساتھ قرضدار کو ایک متعین زائد رقم بھی واپس کرنا پڑتی ہے۔

(ب) قرض خواہ، قرض لینے والے کے ساتھ نقصان میں شریک نہیں ہوتا بلکہ صرف قرض لینے والے کے دیوالیہ ہونے کی صورت کو چھوڑ کر ہر حال میں مقررہ نفع کا طالب ہوتا ہے۔

(ج) قرض خواہ، قرض لینے والے سے اس کے نفع کی نسبت سے نفع پانے کا حقدار نہیں ہوتا بلکہ اس کے نفع کی شرح پہلے سے متعین ہوتی ہے۔

ماہرین اقتصادیات نے اس قسم کے نفع یا سود کی کیا تعریف کی ہے؟ اس سے قطع نظر یہ بات قابل غور ہے کہ اوپر بیان کی گئی صورتوں میں نمبر (۴) کو چھوڑ کر قرض کی دوسری شکلوں میں قرضدار کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کے بجائے اس کی مدد کا عنصر نمایاں ہے۔ دراصل ان تمام قرضوں کو تین اقسام میں بانٹا جاسکتا ہے:

(۱) وہ قرض جن کا مقصد قرض دینے والے کی پیداواری صلاحیت کو بڑھانا یا اسے قرض کے ذریعہ نفع حاصل کرنے کے قابل بنانا ہے۔ قرض لینے والا بھی انھیں اسی مقصد سے حاصل کرتا ہے کہ اس سے نفع حاصل کرے لیکن قرض دینے والے کو نفع میں شریک کرنے کے بجائے ایک متعین شرح پر منافع کا حصہ دیتا ہے۔

(۲) وہ قرض جن کے ذریعہ قرض لینے والا منافع کمانے کے بجائے اپنی ایسی بنیادی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے جو ایک آسودہ اور مطمئن زندگی گذارنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان ضروریات کی تکمیل سے فرد کی صلاحیتوں کو نشوونما اور اس کی کارکردگی بڑھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس صورت پر بھی جو قرضے حکومت یا اس کے ماتحت اداروں کی جانب سے ملتے ہیں انھیں جبر یا یک طرفہ نفع اندوزی اور دوسرے کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کا عنصر (نمبر ۴ کو چھوڑ کر) موجود نہیں ہوتا، بلکہ نفع یا سود کی شرح مناسب رکھی جاتی ہے۔

(۳) وہ قرض جس میں صارفین سے غیر پیداواری قرضوں پر سود شرح اعلیٰ وصول کیا جاتا ہے چونکہ ربوا میں صارف کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا مقصود ہوتا ہے جو آج کل

حکومت یا اس کے ماتحت اداروں کے ذریعہ قرض لینے میں موجود نہیں ہے، لہذا مولانا جعفر شاہ صاحب پھلواری نے اس قسم کے لین دین میں سود کی موجودگی کے سلسلہ میں ایک نیا نکتہ پیدا کیا ہے جو قابل غور ہے، انکا کہنا ہے کہ:

''ربوا کا ترجمہ عام طور انٹرسٹ (Intrest) کیا جاتا ہے، انٹرسٹ کے معنی بیاج اور سود بھی ہیں اور نفع (Profit) کے بھی لیکن جس ربوا کا ذکر قرآن میں آیا ہے اس کا ترجمہ انٹرسٹ (Intrest) کے بجائے یوزری (Usury) زیادہ صحیح ہے'' Usury کے معنی ''آکسفورڈ ڈکشنری'' میں یہ لکھے:

The Practice of Lending Money at Unreasonably High Rates of Interest

(غیر مناسب، حد سے تجاوز، شرح سود پر روپیہ بطور قرض دینا)۔

ملاحظہ ہو(۱):

☆☆☆☆

(۱) (Compact Oxford English Dictonary Edition: 2012)

رپورٹ مولانا مفتی نظام الدین صاحب اعظمیؒ ☆

۱۶؍مئی ۱۹۷۱ء کو مجلس میں تفصیلی رپورٹ پیش کی گئی مگر مزید غور وفکر کے لئے اس

☆ مفتی نظام الدین اعظمیؒ (پ: ۱۹۱۰ء، ت: ۲۰۰۰ء) ماضی قریب کی نابغۂ روزگار شخصیات میں جن مشائخ دیوبند کا نام سرفہرست ہے، ان میں دارالعلوم کے سابق مفتی اعظم، مفتی نظام الدین ہیں، ۱۹۱۰ء مطابق ۱۳۲۸ھ اندارا ضلع اعظم گڈھ میں پیدا ہوئے، آپ کے والد گرامی محمد رفیع صاحب انگریزی حکومت میں ملازم تھے، اور دادا علاقہ کے بڑے رئیس اور زمیندار تھے، اندارا سے چاروں اطراف قریب پچاس ساٹھ گاؤں کی زمینداری ان ہی کی تھی، اس وجہ سے گھریلو حالات دینی اثرات سے خالی تھے، گھر والوں نے انگریزی اسکول میں داخل کیا، قریب سات سال کی عمر میں آپ کو تین روز مسلسل خواب میں حضرت نظام الدین اولیاء کی زیارت ہوئی، آپ کو سینے سے لگاتے تھے، اس کا اثر یہ ہوا کہ آپ گھر چھوڑ کر اپنی بڑی بہن کے پاس گورکھ پور چلے گئے، اور وہیں سے اپنے تعلیمی سفر کا آغاز کیا، گورکھ پور میں حفظ کلام اللہ سے شروعات کی، اور مدرسہ احیاء العلوم مبارک پور اور دیگر علاقائی مدارس پھر مدرسہ عزیزیہ بہار، بعدازاں مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی اپنی تشنگی بجھانے پہونچے، آخر دارالعلوم دیوبند جیسے عظیم درسگاہ جا کر دورۂ حدیث اور افتاء کی تعلیم مکمل کی۔

جامع العلوم اعظم گڈھ سے تدریسی سفر اور وہاں سے گزر کر دارالعلوم مئو میں خدمت تدریس انجام دی، دس پندرہ سال تک یہاں شیخ الحدیث اور مفتی رہے، ۱۹۶۵ء میں حضرت قاری محمد طیب قاسمی نے اصرار سے دیوبند آنے کی دعوت دی لیکن آپ نے منع کر دیا، پھر بالآخر اپنے شیخ مولانا وصی اللہ الہ آبادی کے ایماء پر دیوبند چلے گئے، اور دارالعلوم کے نائب مفتی مقرر ہوئے، ۱۹۷۰ء میں صدر مفتی بن گئے، ۱۹۶۵ء سے تادم آخر دارالعلوم دیوبند کے منصب فتاویٰ سے وابستہ رہے، آپ کے فتاویٰ "نظام الفتاویٰ" کے نام سے چھ جلدوں میں ہیں اور اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے تین جلدوں میں "منتخبات نظام الفتاویٰ" شائع کیا، فقہ وفتاویٰ کے علاوہ اصول حدیث اور صرف ونحو اور دیگر موضوعات پر بھی کتابیں لکھیں، لیکن وہ نایاب ہیں۔

آپ کے مشہور تلامذہ میں شیخ عبدالحق اعظمی، مولانا قمر الزماں الہ آبادی، مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی، وغیرہ ہیں، ۲۶؍فروری ۲۰۰۰ء شب ۹/ بجے مختصر علالت کے بعد دار بقاء کی طرف کوچ فرمایا۔ (تفصیل کے لئے تاریخ دارالعلوم دیوبند ملاحظہ کریں)

پر فیصلہ ملتوی کر دیا گیا۔(۱)

الجواب وباللہ التوفیق

(۱) سوالنامہ اور ضمیمہ کی تصریحات کے بموجب اس زائد رقم کی جو قرضہ کے سلسلہ میں وصول کی جاتی ہے، ٹیکس نہیں قرار دیا جاسکتا اس لئے کہ یہ رقم قرض کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے، اور ٹیکس ان رقوم کا نام ہے جس کو حکومت کسی عارضی سبب کے ماتحت یا مستقلاً بغیر لحاظ قرض کے لوگوں پر مقرر کر دیتی ہے، اور یہاں ایسا نہیں۔

البتہ ان معاملات کا حکم شرعی منقح ہونے کے لئے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ امامنا الاعظم حضرت ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت ربوا پورے قرآن میں زیادہ خوفناک آیت ہے۔

"كان أبو حنيفة رضي الله تعالىٰ عنه يقول: هي (يا أيها الذين آمنوا لا تأكلوا الربوا أضعافا مضاعفة) أخوف آية القرآن، أوعد الله المؤمنين بالنار المعدة للكافرين، أن يتقوه في اجتناب محارمه"۔ (مدارك ج١ ص١٤١)

نیز جس وقت سود (ربوا) کی حرمت نازل ہوئی تھی اس وقت مسلمانوں کے حالات آج سے بہت زیادہ سقیم ونازک وقابل رحم تھے پھر بھی کسی قسم کی گنجائش یا کسی قسم کا اشارہ اباحت وجواز کی طرف نہیں دیا گیا، اس لئے جتنی بھی صورتیں لوگ سود کے وجہ جواز کے سلسلہ میں لکھتے ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی کافی نہیں اور نہ ان کی وجہ سے ربا (ربوا) کو جائز کہہ سکتے ہیں۔

لہذا اس رخ پر کلام کی کوئی حاجت بھی نہیں اور اضطرار ومجبوری میں فقہاء رحمہم اللہ کے کلام سے جو کچھ تسہیل احکام کا شبہ ہوتا ہے اس کا حاصل ومقصود سود (ربا) کو مباح وحلال قرار دینا نہیں ہے، بلکہ پیش از پیش مؤاخذۂ آخرت سے برأت وسبکدوشی وحفاظت ہے

(۱) تفصیل کے لئے "مجلس تحقیقات شرعیہ کی مختصر تاریخ" ص: ۴۳ تا ۴۶ ملاحظہ ہو۔

جیسا کہ عنقریب احقر کے کلام سے بھی معلوم ہوگا۔

البتہ چونکہ ربوا (سود) کا ایک مفہوم شرعی متعین ومنضبط ہے، کسی فرد یا کسی جماعت کے کسی غیر سودی معاملہ کو سود کا نام دے دینے سے اس کو سود کہنا اور اس پر سود کا حکم لگا دینا ضروری نہیں، جیسے پرائیوٹ فنڈ وغیرہ کی رقم میں سود کے نام سے کچھ رقم دینے سے اس کا سود ہونا ضروری نہیں ہے، اسی طرح کسی سودی معاملہ کو کسی فرد یا جماعت کے غیر سودی قرار دینے سے سود کے حکم سے خارج نہیں ہو جائے گا۔ اس لئے یہ شق کلام کی باقی رہ گئی کہ آیا یہ نو پیدہ معاملات جس میں حکومت وقت قرض کے طور پر عوام کو ان کی ترقی و بہبودی کے لئے کچھ سامان یا آلات واسباب کھیتی کرنے کے یا آب پاشی کرنے یا اور صنعت وحرفت یا کارخانہ چلانے کے یا کام بڑھانے کے لئے جیسے مشین، انجن، ٹریکٹر یا اور آلات واسباب بیج، کھاد وغیرہ ادھار، سستے سے سستے داموں پر اس کی قیمت وصول کرنے کے لئے مختلف قسطیں مقرر کر دیتی ہے، اور قسطوں کے متعینہ مدتوں پر وصول نہ ہونے کی صورت میں اس قسط کو کچھ بڑھا کو وصول کرتی ہے اور کبھی ان سامانوں کے ساتھ ان سے کام لینے کے لئے کچھ نقد روپیہ بھی دیتی ہے اور کبھی اپنی عوام کی ترقی و بہبودی کے لئے محض نقد رقم وروپیہ دے کر پھر اس پر کچھ زیادتی کے ساتھ وصول کرتی ہے، مثلاً بے گھر افراد جنہیں اپنی رہائش کے لئے مکان بنانا ہو یا کوئی مفید صنعت شروع کرنا ہو یا اپنے کسی مفید صنعتی کاروبار کو ترقی دینا ہو، اور کوئی صحیح ومفید مقصد ہو اور استطاعت نہ رکھنے کی وجہ سے خود نہ انجام دے سکتے ہوں، نقد قرض دیتی ہے اور پھر اس کو باقساط کچھ زیادتی کے ساتھ وصول کرتی ہے تو آیا یہ معاملہ سودی ہوا یا نہیں، اور اس زائد رقم پر سود کی شرعی تعریف صادق آتی ہے یا نہیں؟ اور یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ معاملہ شرعاً ربوی ہے یا اس کی حقیقت شرعیہ کچھ اور ہو سکتی ہے اس وقت یہی پیش نظر ہے اور اسی کے متعلق حکم شرعی مختصر لفظوں میں واضح کرنا مقصود ہے۔

سوالنامہ میں تصریح ہے کہ اس قسم کی اعانت کے طریقوں سے افراد اور ملک کی ترقی اور انہیں زوال سے محفوظ رکھنا اور ان کی بعض پریشانیاں دور کرنا بلا لحاظ مذہب وملت

ہر باشندۂ ملک کے ساتھ حکومت کا مقصود ہوتا ہے، جیسا کہ بعض مرتبہ بعض حصہ قرض یا بعض حصۂ سامان مفت چھوڑ دینے کے بھی ظاہر ہوتا ہے جس کا صریح مفہوم یہ ہے کہ ان طریقوں سے نفع خیزی یا زراندوزی یا کوئی سودی کاروبار کرنا حکومتوں کا مقصد نہیں ہوتا اور اسی بنا پر سود کے نام سے لی ہوئی جزوی رقم اول تو عام شرح سود سے بہت کم اور بہت تھوڑی ہوتی ہے اور پھر اس سلسلہ کے اخراجات پورا کرنے کے بعد جو رقم بچ جاتی ہے تو اس کو پھر اسی قسم کے اعانتی کاموں میں بالعموم خرچ کر دیا جاتا ہے تو مطابق قاعدۂ مسلمہ فقہیہ "الأمور بمقاصدها وفيها بيان: أن الشيئ الواحد يتضح بالحل والحرمة باعتبار ما قصد له" (قاعده ثانيه من الأشباه والنظائر" ص: ۱۰۲) (۱)

پہلے یہ معلوم ہو چکا ہے کہ یہ زائد رقم ٹیکس نہیں کہی جا سکتی، مگر چونکہ اس قسم کے معاملات کا احتیاج اور ضرورتیں عام ہوتی جا رہی ہیں اور عموم کا ایک درجہ اختیار کر چکی ہیں اور جن رقوم سے حکومتیں اس کے لئے سرمایہ اکٹھا کر کے بطور اعانت افراد قوم کو دیتی ہیں وہ رقوم عموماً بلا لحاظ ملت ومذہب باشندگان ملک سے بطور وقتی ٹیکس یا مستقل ٹیکس وصول کرتی ہیں، اور ان ٹیکسوں کے دینے میں مسلم وغیر مسلم سبھی شریک ہوتے ہیں بلکہ دینے پر مجبور ہوتے ہیں، اب اگر مسلمان ان اعانتی رقوم کو حکومت سے مجبوری کی حالت میں بھی حاصل نہ کریں تو ان کو ڈبل خسارہ ہوگا، اس لئے ضرورت داعی ہے کہ اگر کوئی توجیہ وتاویل ان معاملات کے حدود شرع میں لانے کی ہو سکتی ہو تو حفظاً للعوام تلاش کرنی چاہئے، کما سيجئ استحسانه۔

پس ان معاملات میں سے ایک کے اندر توجیہ اس طرح کی جا سکتی ہے کہ اس جزوی رقم کو جو سود کے نام سے لی جاتی ہے، وہ حقیقت میں سود نہیں ہے، بلکہ اس طریقہ کا انتظام ٹھیک رکھنے والوں کی اجرت میں اور جو سامان وغیرہ اس میں خرچ ہوتے ہیں یا درکار ہوتے ہیں، ان کی قیمت میں جاتی ہیں، جس سے انتظام میں سہولت رہتی ہے اور اعانت

(۱) جدید نسخہ میں عبارت یوں ہے: "الشيئى الواحد يتصف بالحل والحرمة باعتبار القصد....."۔

لینے والے اور دینے والے کا معاملہ صاف رہتا ہے اور حساب درست وٹھیک رہتا ہے اور یہ محض ایک قومی ومشترکہ نظام کی صورت ونوعیت ہے کوئی سودی کاروبار نہیں ہے، بلکہ قوم کا سرمایہ ہے اور قوم ہی کے کام میں صرف کیا جاتا ہے، اس لئے اس کے منتظمین وکارکنان قوم کے اجیر ووکیل ہوسکتے ہیں، اور غریبوں کی اعانت اور پسماندوں کو آگے بڑھانے اور ان کے لئے اسباب معیشت فراہم کرنے کی راہیں کھولنے کا ایک انتظام کہا جاسکتا ہے۔

نیز اس طریقۂ کار اور محکمہ میں نفع وسہولت دونوں جانب کو قریب قریب یکساں حاصل ہوتی ہیں اور سود تو نام ہے اس نفع وزیادتی کا جو محض ایک جانب کو حاصل ہو اور عوض سے خالی ہو، کما صرح به الفقهاء: "الربوا هو فضل خال عن عوض لأ حد المتعاقدين فی عقود المعاوضة" (هذا التعريف يستفاد من الشامی من باب الربوا)

غرض یہ مفہوم سود سے جدا مفہوم کہا جاسکتا ہے اور یہ توجیہ قریب قریب ایسی ہی ہوگی جو اس رقم میں کی جاتی ہے جس کو حکومت اپنے ملازمین کو ختم ملازمت کے وقت اگرچہ سود کے نام سے دیتی ہے مگر ہمارے محققین فقہاء اس کو سود نہیں کہتے بلکہ انعام کہتے ہیں اور جائز قرار دیتے ہیں جب کہ امداد الفتاوی جلد (۳) ص ۱۲۳ تا ص ۱۲۵ میں اس کی تصریح موجود ہے۔

نیز یہ توجیہ ایسی ہوگی جیسے منی آرڈر کی فیس میں کی جاتی ہے کہ فیس کو اجرت کتابت واجرت روانگی فارم کہا جاتا ہے، حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ ایک طویل سلسلۂ کلام میں فرماتے ہیں:

''البتہ بہت عرق ریزی سے اس قدر تاویل کی گنجائش ہوسکتی ہے کہ فیس منی آرڈر کو اجرت کتابت وروانگی فارم کہی جائے، اس سے اس کی حرمت تفاضل تو رفع ہوجائے گی مگر کراہیت باقی رہے

گی''۔ (امداد الفتاوی، ج ۳ ص ۱۰۶ جدید ایڈیشن، مطبوعہ دارالعلوم کراچی، پاکستان)

پھر دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

''اور معاملہ پیش نظر میں جب اشکال حرمت تفاضل کا ختم ہوگیا تو اباحت اصلیہ لوٹ آئے گی، وھوالمراد''

پھر اسی امداد الفتاوی جلد ۳ ص ۱۰۸ میں فرماتے ہیں:

''البتہ فیس منی آرڈر کو اجرت کتابت وروانگی فارم کی کہہ کر حرمت تفاضل کو رفع کیا جاسکتا ہے لیکن کراہیت سفتجہ (۱) کے رفع کی کوئی وجہ خیال میں نہیں آتی، گو ابتلائے عام کی وجہ سے دل ضرور چاہتا ہے کہ اس کی بھی کوئی وجہ نکل آئے (الیٰ قولہ) حتی کی اگر یہ بھی نقل صحیح سے مل جائے کہ سفتجہ کے جواز کی طرف ائمہ اربعہ میں سے کوئی امام گئے ہیں تب بھی بضرورت اس پر عمل کرنے کو کہا جائے گا''۔

پھر جلد ۳ ص ۱۰۸ میں فرماتے ہیں:

''منی آرڈر مرکب ہے ہر دو کلمہ سے، ایک قرض سے جو اصل رقم سے متعلق ہے، دوسرے اجارہ سے جو فارم کے لکھنے اور روانہ

(۱) موجودہ دورہ میں ہنڈی کا کاروبار، جس میں رقم بھیجنے والا، دوسرے ملک یا شہر میں اپنے کسی شناسا سے مطلوبہ رقم کی ادائیگی کے لئے کہہ دیتا ہے اور وہ اس پر کچھ فیس لیتا ہے، پہلے راستہ کی دشواری کی وجہ سے ایسا کرتے تھے اور اب قانونی مجبوری سے ایسا کرتے ہیں، فتاوی عالمگیریہ میں ہے ''وكره السفاتج وهو قرض استفاده به المقرض سقوط خطر الطريق'' (فتاوی عالمگیریہ ۳/۲۹۴)۔

آگے کئی صورتیں لکھی ہیں، مثلاً: ''صورته دفع إلى تاجر عشرة ليدفعها إلى صديقه، وإنما يدفع على سبيل القرض، لاعلى سبيل الأمانة، ليستفيد به سقوط خطر الطريق، فإن لم تكن المنفعة مشروطة، ولا كان فيه عرف ظاهر فلا بأس به'' (ایضا)

کرنے پر بنام فیس کے دی جاتی ہے، اور دونوں معاملے جائز ہیں
اور چونکہ اس میں ابتلائے عام ہے اس لئے جواز کا فتوی مناسب
ہے''۔(انتہی بلفظہ)

امداد الفتاوی کی ان مجموعی عبارتوں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس قسم کے معاملات میں جب ابتلائے عام ہوجائے یا ضرورت شرعیہ داعی ہوجائے تو حدود شرعیہ میں رہتے ہوئے جہاں تک ہوسکے توجیہ جواز تلاش کرنا عمل مستحسن ہے، نیز عالمگیری کی کتاب الحیل کی عبارت سے بھی ایسا ہی مفہوم ہوتا ہے(۱)، حاصل یہ ہے کہ اس قسم کے حل اور توجیہات کا مدار ابتلائے عام اور ضرورت صحیحہ معتبرہ پر ہے، اور سوالنامہ وضمیمہ سے بھی ان دونوں چیزوں کا وجود ضرور ملتا ہے، اس لئے یہ توجیہ مستحسن بھی ہوسکتی ہے۔

پس ان معاملات میں جس وقت محض سامان وآلات وغیرہ ادھار دے کر اس کی قیمت مقررہ قسطوں کے مطابق وصول ہو تو اس میں تو کسی کو شبہ کی کوئی وجہ نہیں ہوسکتی، اسی طرح وقت پر کسی ایک قسط کے یا تمام قسطوں کے وصول نہ ہونے پر جو رقم زائد وصول ہوتی ہے یا جس معاملہ میں سامان وغیرہ کے ساتھ اس کو برتنے کے لئے حسب ضرورت کچھ نقد بھی لیا جاتا ہے، اور اس کی ادائیگی میں بڑھا کر دیا جاتا ہے ان سب کو انتظامات کی ادائیگی کے لئے ایک قسم کی فیس اور اس نقد رقم کو مزید اعانت کہہ سکتے ہیں۔ برتنے کی ضرورت کی مقدار سے زائد لی جائے یا محض نقد روپیہ بطور قرض کے لیا جائے اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے تو سود کی تعریف صادق آجائے گی، مقدار نفع کم ہو یا زیادہ اس میں کوئی تاویل نہ چل سکے گی، اور حتی المقدور اس کے قریب بھی جانا جائز نہ ہوگا، اور بغیر ضرورت وحاجت شدیدہ کے کوئی گنجائش نہ نکل سکے گی، جیسا کہ عنقریب معلوم ہوگا۔

(۱) عبارت یہ ہے: ''وكل حيلة يحتال بها الرجل ليتخلص بها عن حرام أو ليتوصل بها إلى حلال، فهي حسنة، والأصل في جواز هذا النوع من الحيل قول الله تعالىٰ" وخذ بيدك ضغثا فاضرب به ولا تحنث" وهذا تعليم المخرج لأيوب النبي عليه وعلى نبينا الصلاة والسلام۔'' (عالمگیری، کتاب الحیل، ج۶/۳۹۰-دارصادر، بیروت)

(۲) چونکہ سود لینا اور دینا دونوں حرام ہیں اگر فرق ہوسکتا ہے تو یہ کہ سود دینے میں ایک فعل حرام کا ارتکاب ہوتا ہے اور مال حرام اپنی ملک میں نہیں آتا، اور سود لینے میں فعل حرام کا ارتکاب بھی ہوتا ہے اور مال حرام وخبیث بھی اپنی ملک میں آتا ہے، اور یہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ جس چیز کا سود ہونا معلوم ہوجائے اس کے مطلقا جواز کا قائل کوئی بھی نہیں ہوسکتا، اس سے یہ بات نکل آئی کہ حاکم عام کو رعایا کے احوال پر جن بعض تصرفات کا خصوصی حق حاصل ہوتا ہے اس میں سودی قرضہ وصول کرنے کا حق شرعا نہیں ہوگا، اگر حکومت قانونی دباؤ کی وجہ سے وصول کرے گی اور دینے والے قانونی مجبوری کی وجہ سے دیں گے کہ اگر نہ دیں تو جان ومال، عزت وآبرو کا خطرہ ہوگا تو امید ہے کہ عنداللہ ماخوذ نہ ہوں گے۔

(۳) جن معاملات میں مذکورہ توجیہیں چل سکتی ہیں مثلا (بلا نقد کے سامان ادھار خریدنا اور قسطوں کے صحیح وقت ادا نہ کرنے کی وجہ سے کچھ زائد رقم بنام سود دینا یا سامانوں کے ساتھ ان سامانوں کا برتنے اور کام میں لانے کے مطابق کچھ نقد لینا اور پھر کچھ زائد کر کے دینا) ان کے جواز میں کوئی شبہ نہیں، اور جن معاملات میں مذکورہ توجیہیں نہیں چل سکتی جیسے محض نقد روپیہ بطور قرض لینا، یا سامانوں کے ساتھ کام چلانے کی ضرورت سے زائد نقد لینا اور پھر اس پر نفع دینے کا معاملہ کردینا تو زائد از ضرورت نقد کے نفع پر یا بلا ضرورت شدیدہ محض نقد روپئے بطور قرض لینا یا ضرورت ہی کے ماتحت محض نقد قرض لینا اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کرنا، یہ سب صراحۃً سود میں داخل ہوگا اور حرام ہوگا، ہاں! اگر ضرورت واقعیہ مجبوری سے یا حاجت شدیدہ کی مجبوری سے کہ بغیر اس قرض کے کوئی شکل گذر بسر کی نہ ہو، بے گھر بار ہوں یا گذر بسر تو ہوسکتا ہے مگر بے حد تکالیف کا سامنا ہوگا، تو رفع ضرورت ورفع حاجت کے انداز سے لے لینے کی گنجائش ہوگی، جیسا کہ الاشباہ والنظائر کے قاعدہ رابعہ: "المشقة تجلب التيسير" اور قاعدہ سادسہ من الخامسة:

"الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة" اوراس صریح جزئیہ (ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح) سے معلوم ہوتا ہے۔

(۴) ایسا ملک جہاں اقتدار اعلی مسلمانوں کو حاصل ہے اور بلاسودی قرض کا نظام اختیار میں ہے، وہاں اس مسلم صاحب اقتدار پر صاف اور واضح طریقہ پر ایسے معاملات کا رائج وجاری کرنا ضروری ہوگا جس میں عدم ربوا کا یقین ہو اور کہیں ربوا کا نام بھی نہ آئے، اگر وہ صاحب اقتدار مسلم خود اس فریضہ کو انجام نہ دے تو اس کے بعد والے صاحب اقتدار حکومت پر درجہ بدرجہ حتی کی عوام میں بھی جو صاحب اقتدار ہوں ان سب پر حسب حیثیت وقدرت اس اعلی صاحب اقتدار کو اس طرف متوجہ کرنا اور اس پر عمل کرنے کے لئے آمادہ کرنا اور اس کو رواج دینے میں کوشش کرتے رہنا ضروری ہوگا، اسی طرح جس ملک میں اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کو حاصل نہیں لیکن حکومت کو متوجہ کرنا مسلمانوں کے اختیار میں ہو اور متوجہ کرنے پر نفع کی توقع بھی ہو تو مسلمانوں پر صاحب اقتدار اعلیٰ کو اس طرف متوجہ کرنا کہ غیر سودی قرض کا انتظام ہونا چاہئے، علی حسب قدرت واستطاعت ضروری رہے گا، اور جس ملک میں مسلمانوں کی یہ پوزیشن بھی نہ ہو، ان کا حکم دوسرا ہوسکتا ہے۔ فقط

واللہ اعلم

☆☆☆☆

رپورٹ مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ ☆

(۱۶/مئی ۱۹۷۱ء کو رپورٹ پیش ہوئی جو منظور نہ ہوسکی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ہندوستان غریب اور پسماندہ ملک ہے، اور یہاں بسنے

☆ مولانا سید منت اللہ رحمانی (پ: ۱۹۱۳ء- ت: ۱۹۹۱ء) بانی ندوۃ العلماء، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے فرزند ارجمند اور بہار واڑیسہ کے امیر شریعت رابع، مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری، خانقاہ رحمانی مونگیر کے ۴۹ سال تک سجادہ نشین، جامعہ رحمانی مونگیر کے سرپرست اور بانی ثانی، بلند فکر عالم دین اور بے باک ملی رہنما، ۷/اپریل ۱۹۱۳ء میں مونگیر میں پیدا ہوئے، آپ کے اساتذہ میں شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی، علامہ ابراہیم بلیاوی، حضرت میاں سید اصغر حسین دیوبندی، اور مفتی محمد شفیع عثمانی ہیں۔

ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کرنے کے بعد عربی صرف ونحو کی تعلیم حضرت مولانا عبد الصمد رحمانی سے حاصل کی پھر ۱۱/سال کی عمر میں حیدرآباد جاکر حضرت مولانا مفتی عبد اللطیف صاحب (سابق صدر شعبۂ دینیات، عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد) سے کتابیں پڑھیں، اور ان کی خدمت میں ایک سال قیام کیا، متوسط تعلیم چار سال تک دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں حاصل کی، اور اعلی تعلیم دار العلوم دیوبند میں ۱۳۴۹ھ میں داخل ہوئے اور ۱۳۵۲ھ میں علوم عالیہ کی تکمیل سے فارغ ہوئے، بخاری شریف شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے پڑھی۔

فراغت کے بعد ملت اسلامیہ کی ہر طرح خدمت کی ہے، تصنیف وتالیف، تحریر وتقریر جملہ طریقہائے تبلیغ سے اللہ کے بندوں کو اللہ کے دربار میں حضوری کا درس دیا۔

آپ نے متعدد کتابیں اور رسالے تصنیف فرمائے بالخصوص فقہی اور مسلمانوں کے پرسنل لا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

والی مسلم نامی قوم، سب سے زیادہ پریشان حال اور مفلوک الحال ہے، اور اس قوم کی اقتصادی حالت اس درجہ خراب ہوتی جارہی ہے، کہ ''کاد الفقر أن یکون کفرا'' کا خطرہ نظر آتا ہے، اور اس کی بڑی وجہ محنت ومشقت سے فرار اور صبر واستقلال سے گریز ہے، مسلمانوں کی بڑی تعداد نے آباء واجداد سے ورثہ میں ملے ہوئے قلیل ذرائع معاش پر قناعت کر رکھی ہے، اور خود معاش کے لئے جد وجہد کرنے اور اس سلسلہ میں جدید ترین طریقوں کی تلاش اور اس کے استعمال کی طرف سے غافل ہیں، اس قوم کا ایک اچھا خاصا اور قابل ذکر طبقہ کما کر خرچ کرنے کا نہیں بلکہ اپنی جائیداد کو بیچ کر خرچ کرنے کا عادی ہو چکا ہے، اور اپنی ملکیت رہن رکھ کر اور سودی قرض لے کر اپنے بڑے اخراجات پورے کرتا ہے،

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) کے موضوعات پر، آپ کا اردو اسلوب پختہ، سادہ اور دلکش تھا، آپ کی تصانیف میں ''سفر نامہ مصر وحجاز'' کو بڑی شہرت ملی، اس کے علاوہ مسلم پرسنل لا، مکاتیب گیلانی وغیرہ ہیں۔

انگریزی سے واقفیت رکھتے تھے، تقریر وتحریر دونوں پر یکساں قدرت تھی، جامعہ رحمانی کا از سر نو احیاء فرمایا، اور اس کو بہت ترقی دی، ان کی زندگی میں یہ بہت مشہور مدرسہ بن گیا۔

امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کو آپ کے دور میں ملک گیر شہرت حاصل ہوئی، ملک کے مختلف صوبوں اور علاقوں میں امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے طرز پر نظامِ امارت قائم ہوا۔

۱۳۵۵ھ میں بہار اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے، ۱۳۶۱ھ میں خانقاہ رحمانی کے سجادہ نشین بنائے گئے، ۱۳۷۴ھ میں دار العلوم دیوبند کی شوری کے رکن منتخب ہوئے اور تا حیات رکن رہے، ۱۳۷۶ھ میں غیر منقسم بہار اور اڑیسہ کا امیر شریعت منتخب کیا گیا، ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۲ء میں موتمر اسلامی قاہرہ میں ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت فرمائی، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے قیام کے محرک اور ابتداء سے تا حیات جنرل سکریٹری رہے، الغرض آپ ملک کے عظیم عالم وقائد تھے، ان کی ذہانت، اصابت رائے، قوت فیصلہ، ہر مجلس میں ان کی پہچان تھی، افسوس علم وعمل کا یہ پیکر، اور سرچشمۂ اخلاق ووفا، ۲-۳ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ مطابق ۱۹-۲۰ مارچ ۱۹۹۱ء سہ شنبہ وچہار شنبہ کی درمیانی شب میں اس جہان آب وگل سے روپوش ہوگیا، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

(تفصیل کے لئے دیکھئے: پس مرگ زندہ، ص ۲۱۴-۲۸۳- پرانے چراغ سوم، اور سوانح حضرت امیر شریعت (منت اللہ رحمانی) وغیرہ۔)

اسی طرح اس طبقہ نے اپنی زمینداریاں فروخت کر دیں اور اپنے وارثوں کے لئے کچھ نہ چھوڑا، یا بہت کم چھوڑا، اور اب کاشت ومکانات وغیرہ کی فروختگی میں ہاتھ لگایا ہے، گھر میں عورتوں کے پاس جو زیورات تھے، وہ مہاجنوں اور ساہوکاروں کے پاس گروی ہو چکی، جن کی واپسی کی توقع بھی دس پندرہ فیصدی سے زیادہ نہیں، غرض مسلمانوں کی اقتصادی ومعاشی زبوں حالی نے نہایت بھیانک شکل اختیار کر لی ہے، اور ہر دردمند انسان کا فرض ہے کہ وہ پوری ہمدردی کے ساتھ اس کے معاملات پر غور کرے، اور اس معاشی بحران سے اسے نکالے جو دنیا میں فقر وفاقہ اور انتہائی ذلت کا ذریعہ بن سکتی ہے، اور دین میں کفر وارتداد کے دروازے کھول سکتا ہے۔

ہندوستان کی حکومت نے ملک کی غریبی اور معاشی بدحالی کے پیش نظر ملک کے افراد کو زوال سے محفوظ رکھنے، ان کی پریشانیوں کو دور کرنے اور معاشی حالت سدھارنے اور ان کے معیار زندگی کو ممکن حد تک بلند کرنے کی خاطر، مختلف عنوانات کے تحت متنوع طریقہ پر انہیں قرض دینے کا منصوبہ بنایا ہے، جو عملاً جاری ہے، اور ملک کے ہزار ہا افراد قرض لے کر فائدہ اٹھا رہے ہیں، اور ان کی معاشی حالت ایسی ہوتی جارہی ہے جس سے وہ آج کے زمانہ کے بڑھے ہوئے بنیادی اور ضروری اخراجات کا بوجھ بے تکلف اٹھا رہے ہیں، اور بہتیرے مسرفانہ زندگی بھی گذار رہے ہیں۔

حکومت جو قرض دیتی ہے اس پر مختلف معین شرحوں میں کچھ زائد رقم لیتی ہے، جسے وہ (Intrest) قرض کا نفع کہتی ہے، ظاہر ہے کہ حکومت یہ قرض نفع خوری کے لئے نہیں دیتی اور نہ اس سے حکومت کا مقصد سودی کاروبار کرنا ہے، بلکہ قرض دینے کا مقصد تو وہی ہے جس کا ذکر اوپر آیا، قرض پر کچھ زائد رقم اس لئے لیتی ہے کہ قرض دینے اور واپس لینے کے اخراجات اس سے پورے ہوں، ورنہ حکومت کا سرمایہ گھٹتا جائے گا، اور اس لئے بھی کہ قرض لینے والے کے ذہن پر قرض کی اہمیت، اور اس کے دل میں قرض کی واپسی کی کھٹک پیدا ہو۔

اس زائد رقم پر ربوا کی تعریف صادق آتی ہو یا نہیں اور اسے سود کہا جائے یا ٹیکس، بہر حال ہے یہ ایسی رقم ہے جو قرض سے زائد ہے، اور جس کا کوئی عوض قرض لینے والے کو نہیں ملتا، اور آئندہ اگر کوئی عوض کسی درجہ میں رفاہ عام کے کاموں کے ذریعہ ملنے والا بھی ہے، تو وہ حکومت کے عام خزانہ کے ذریعہ ملے گا، جس میں یہ زائد رقم بہت ہی جزوی اور معمولی مقدار میں جا کر جمع ہوتی ہے۔

یہ قرض، حکومت افراد واشخاص کو دیتی ہے، یا چند افراد پر مشتمل سوسائٹی کو، دونوں صورتوں میں افراد کی جانچ ہوتی ہے، اگر ان میں قرض لینے اور اسے ادا کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے تو قرض ملتا ہے ورنہ نہیں۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا کہ مسلمان سب سے زیادہ معاشی پریشانی اور اقتصادی زبوں حالی کا شکار ہیں، اور مذکورہ بالا قرض لینے اور اس سے استفادہ کرنے کے اسباب و دواعی مسلم افراد میں زیادہ پائے جاتے ہیں، اور اسی قوم میں ہزار ہا افراد ایسے ہیں جنھیں اس قسم کا قرض لینے کی شدید ضرورت ہے، اور وہ ضرورت متعدبہ اور شرعی ہے، بلکہ بہت سے ایسے ہیں جن کی ضرورت اضطرار کی سرحدوں سے مل رہی ہے، کوئی قرض دینے والا نہیں، بلا سودی قرض ملنا تو گویا ممکن ہی نہیں، اگر سودی قرض ملے گا بھی تو کسی مہاجن کے پاس سے جس کا روزگار ہی سودی کاروبار کرنا ہے، اور جسے حکومت کے مقابلہ میں دونا اور ڈھائی گنا سود ادا کرنا ہوگا۔

مسلم افراد اگر اس طرح کا قرض حکومت سے لے کر اپنی اپنی معاشی حالت کو کچھ سدھار لیں، تو شخصی طور پر اس نفع سے زیادہ ان مفاسد کا سد باب ہوگا، جو غریب وافلاس، بے کاری اور بے روزگاری کے باعث مسلم افراد و جماعت دونوں دینی اور دنیاوی دونوں طریقوں سے پیش آسکتے ہیں، اس لئے مذکورہ بالا ضرورت شرعی کے تحت قرض لینا جلب منفعت سے زیادہ دفع مضرت اور رفع مفاسد کا ذریعہ ہوگا۔

مذکورہ بالا حالات وحقائق کی روشنی میں، مجلس تحقیقات شرعیہ کسی عام حکم شرعی کا

اعلان کئے بغیر یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اگر کوئی شخص، جو معاشی پریشانی و پراگندگی میں مبتلا ہے، اور وہ یقین کرتا ہے کہ مذکورہ بالا قسم کے قرض کے بغیر اس کا کام چل ہی نہیں سکتا، تو وہ اپنی مجبوریاں اور ضروریات کسی عالم ومفتی کے سامنے پیش کر کے اور ان سے اذن حاصل کر کے مذکورہ بالا قسم کے قرض سے استفادہ کر سکتا ہے۔

☆☆☆☆

جواب مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ ☆

کرم فرما محترم مولانا محمد اسحٰق صاحب تقبل اللہ تعالیٰ مساعیھم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

سوالنامہ متعلقہ ہلال عیدین کا جواب دو ہفتے پہلے روانہ کر چکا ہوں، دوسرا سوالنامہ متعلقہ ''حصول قرض از حکومت'' پر اپنی معلومات لکھنے کا بھی فوراً ہی قصد تھا مگر اس

☆ مفتی محمد شفیع عثمانی دیوبندی (پ: ۱۸۹۷ء- ت: ۱۹۷۶ء) علامہ، مفسر، محدث، محقق، فقیہ النفس اور مفتی اعظم پاکستان، ۲۱ر شعبان ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۷ء میں دیوبند میں پیدا ہوئے اور علم وعرفان کی گود میں پروان چڑھے، آپ کے والد ماجد مولانا محمد یٰسین دیوبندی، ایک جید عالم دین اور صاحب نسبت بزرگ تھے، ابتدائی تعلیم والد گرامی سے حاصل کی، اور عربی اول سے فراغت تک تعلیم دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی، ۱۳۲۵ھ تا ۱۳۳۵ھ دس سال مسلسل دارالعلوم دیوبند میں علم کی خوشہ چینی میں مشغول رہے، اور بچپن ہی سے کبار علماء سے تحصیل علم میں لگے رہے، طالب علمی کے زمانہ سے آپ کا شمار ممتاز اور فائق طلبہ میں ہوتا تھا، علامہ انور شاہ کشمیری سے ترمذی شریف وشمائل ترمذی اور بخاری شریف پڑھی، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی سے موطأ امام مالک اور موطأ امام محمد، شرح معانی الآثار، تفسیر جلالین اور مشکوۃ پڑھی، مولانا سید اصغر حسین ہاشمی حسنی سے سنن ابی داؤد، سنن نسائی اور اواخر ترمذی کا کچھ حصہ پڑھا، شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی سے مسلم شریف، اور شیخ الادب مولانا اعزاز علی امروہوی سے ادب کا درس لیا، ان کے ساتھ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن کی مجالس سے استفادہ کیا اور شیخ الہند کے اسیر مالٹا ہو جانے کے بعد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے رجوع ہوئے اور بیعت وخلافت سے سرفراز ہوئے۔

فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس ومفتی ۲۶/ سال تک خدمت انجام دیتے رہے، اور مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کے انتقال کے بعد دارالافتاء کے صدر مفتی مقرر ہوئے، اور اپنے قلم سے چالیس ہزار فتاوی لکھے، جن میں سے کچھ ''امداد المفتیین'' کے نام سے آٹھ ضخیم جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں، ۱۹۴۳ء میں مستعفی ہو کر (بقیہ اگلے صفحہ پر)

وقت مشرقی پاکستان کا سفر پیش آ گیا اور واپسی کے بعد ہی میرے پاؤں میں نقرس کا درد اور ورم ہو گیا، مرض بہت پرانا ہے، کبھی کبھی درد ہوتا ہے، پانچ روز سے بستر پر ہوں، نماز بھی بستر پر ہی ادا کرتا ہوں، اس غیر اختیاری فرصت نیز ضروری ڈاک لکھنے کا سلسلہ رہا، اسی میں اس سوالنامہ کے متعلق اپنا خیال عرض کر رہا ہوں، واللہ سبحانہ وتعالیٰ اسأل السداد والصواب۔

الجواب

(۱) جو سود حکومت کے قرض پر دیا جاتا ہے اس پر محصول یا ٹیکس کی تعریف صادق آتی ہے یا نہیں؟ اس پر جہاں تک غور کیا دونوں میں بڑا فرق ہے۔ ٹیکس حکومت کی طرف سے از خود عائد کردہ ایک ذمہ داری ہے جو ملک کے ہر باشندہ کو بحیثیت باشندۂ ملک ادا کرنا ضروری ہے، اس کا معیار ظاہر ہے کہ حکومت کسی خاص پیمانے پر مقرر کرتی ہے، وہ پیمانہ باشندگان ملک کی املاک ہی ہو سکتی ہیں، انھیں کو معیار بنا کر یہ ٹیکس وصول کیا جا سکتا ہے۔ اس ٹیکس کو انسان کا اختیاری کام اس بنا پر قرار دینا کہ املاک کا رکھنا تو اختیاری جو آدمی نہ کوئی گھر رکھے نہ جائداد اور مکان ہو، اس ٹیکس سے بچ سکتا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے کوئی حکومت باشندگان ملک کے رؤس پر کوئی ٹیکس

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) تحریک پاکستان میں حصہ لیا، اور علامہ شبیر احمد عثمانی کی دعوت پر اپنا آبائی وطن چھوڑ کر پاکستان ہجرت کی، ۱۹۴۹ء میں پاکستان دستور ساز کمیٹی میں شریک ہوئے، آپ تحریک پاکستان کے اہم رہنما اور مفتی اعظم پاکستان تھے، ۱۹۵۱ء میں دارالعلوم کراچی قائم کیا، یہاں آپ کے قلم سے تقریباً اسی ہزار فتاوی درج رجسٹر ہیں، یہ ان کے علاوہ ہیں جو آپ سے زبانی یا فون یا ملاقات پر دریافت کئے گئے۔

آپ کی تالیفات سو سے متجاوز ہیں، ان میں معارف القرآن ۸/ جلدیں، جواہر الفقہ ۵/ جلدیں، سیرت خاتم الانبیاء، ختم نبوت، آلات جدیدہ کا شرعی حکم وغیرہ ہیں۔

ماہ شوال گیارہویں شب ۱۳۹۶ھ مطابق ۶/ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں وفات پائی اور دارالعلوم کراچی کے مقبرہ میں مدفون ہوئے۔ (تفصیل کے لئے: البلاغ کراچی کا خصوصی شمارہ، نقوش رفتگاں، میرے والد میرے شیخ، اور مقدمہ احکام علوم القرآن دیکھیں)۔

عائد کردے تو اس کو یہ کہہ کر اختیاری قرار دیا جائے کہ یہ شخص اگر خودکشی کرے تو زندہ فرد نہ رہے گا، ٹیکس سے بچ جائے گا۔ ضروریات زندگی سے سبکدوش ہوجانا بھی ایک قسم کی خودکشی ہی کہلاسکتی ہے، صرف انکم ٹیکس کے معاملہ میں یہ بات بظاہر کہی جاسکتی ہے کہ زیادہ مالدار ہونا ضروریات زندگی میں داخل نہیں، اس لئے ٹیکس کی ادائیگی سے بچنے کے لئے زیادہ مالداری کو چھوڑا جاسکتا ہے مگر اس کی مثال بھی ایسی ہے کہ کسی جگہ زیادہ مالدار ہوجانے سے چوری کا خطرہ غالب ہو تو وہاں یہ حکم نہ عقلی طور پر دیا جاسکتا ہے نہ شرعی طور پر کہ مال رکھنا ہی چھوڑ دیا جائے ورنہ چوری کرانا تمہارا اختیاری فعل سمجھا جائے گا۔

سود کا معاملہ درحقیقت ایک معاملہ ہے، جو طرفین کی رضامندی پر موقوف ہے۔ حکومت بھی اس کو معاملہ ہی قرار دیتی ہے، اگر کوئی شخص ساری عمر حکومت سے قرض نہ لے تو اس پر کوئی باز پرس عائد نہیں کرتی، رہا یہ معاملہ کہ شرح سود حکومت خود مقرر کرتی ہے اس میں قرضخواہ کا کوئی دخل نہیں، اس کی حقیقت اس سے زائد نہیں ہے کہ عام معاملات میں بھی بہت سی کمپنیاں اپنی چیزوں کی قیمتیں خود مقرر کرتی ہیں خریدار کا کوئی دخل تقرر قیمت میں نہیں ہوتا، اسی طرح بہت سی چیزیں جو اجارہ پر دی جاتی ہیں، شرح اجارہ کو خود مالک، فرد یا کمپنی طے کر کے اعلان کرتی ہے، لینے والوں سے کچھ نہیں پوچھتی لیکن اس وجہ سے اس معاملہ کو غیر اختیاری اس لئے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ خریدار یا مستجیر اس کی شرح قیمت یا شرح اجارہ پر راضی ہوتا ہے تبھی معاملہ کے لئے اقدام کرتا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حکومت کو دیئے ہوئے سود کو حکومت کے ٹیکس پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق البین ہے، اس سود کو صرف اس لئے سود نہیں کہتے کہ حکومت نے اس کا نام سود رکھ دیا ہے بلکہ ہر حیثیت سے وہ سود ہی کی تعریف میں آتا ہے۔

(۳،۲) جن مقامات میں اقتدار اعلیٰ غیر مسلموں کا ہے وہاں مسئلہ مختلف فیہا بین الفقہاء

میں بضرورت اس قول پر فتوی دیا جاسکتا ہے جس میں ان لوگوں سے معاملہ ربوا کی اجازت دی گئی ہے، کما ھو قول الإمام الأعظم أبی حنیفةؒ وھو مختار المشائخ فی أمثال ھذہ الأحوال المذکورة فی السوال، واللہ سبحانہ وتعالی أعلم۔

بندہ محمد شفیع عفا اللہ عنہ
دارالعلوم کراچی ۳۹
۴/ذیقعدہ ۱۳۸۶ھ

☆☆☆☆

جواب متعلقہ قرضہ از حکومت ☆

منجانب دارالافتاء امارت شرعیہ بہار واڑیسہ

حکومت اپنی رعایا کو جو قرض دیتی ہے اس کے سود پر میرے نزدیک ٹیکس کی

☆ مفتی محمد یحییٰ قاسمی (پ:.....ت:۲۰۱۲ء) ایک علمی خانوادہ کے فرد فرید تھے، آپ کے والد ماجد مولانا محمد ذاکر حسین اور دادا مولانا شرف الحق بھی عالم دین تھے، مفتی صاحب کی ولادت اپنے نانیہال مقام ''ھرما'' ضلع مظفر پور (بہار) میں ہوئی، جب کہ آبائی وطن ''رشیورہ'' ہے۔

آپ کے والد گرامی مدرسہ مصباح العلوم، الہ آباد اور دادا دارالعلوم دیوبند سے فارغ تھے، حضرت شیخ الہند کے تلامذہ اور حضرت مدنیؒ کے رفقاء درس میں تھے، حضرت مدنیؒ جب بھی دربھنگہ یا علاقہ میں آتے تو تلاش کر کے ان سے ملاقات کرتے۔

مفتی صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار کے قائم کردہ ''مدرسہ محمودیہ'' میں حاصل کی، اس کے بعد مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں داخل ہوئے، چند سال یہاں تعلیم حاصل کر کے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، اور وہاں تقریباً چار سال تعلیم حاصل کی، اور ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۵۰ء میں فارغ ہوئے، آپ کے اساتذہ کرام میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی، مولانا اعزاز علی امروہوی، مولانا مفتی مہدی حسن شاہجہانپوری، مولانا احمد حسین بہاری، اور مولانا معراج صاحب وغیرہ تھے۔

فراغت کے بعد افتاء میں داخلہ لیا اور مفتی مہدی حسن صاحب کے پاس اس کی تربیت لی، اور ایک سال مزید قیام کر کے افتاء کی مشق وتمرین کی۔

بیعت وسلوک کا تعلق حضرت مدنیؒ سے تھا، ان کی وفات کے بعد خانقاہ رحمانی مونگیر کے ایک بزرگ جو حضرت مدنی کے خلیفہ تھے، ان سے بیعت ہوئے، ان کے انتقال کے کئی سالوں بعد حضرت قاری سید صدیق احمد باندویؒ سے بیعت ہوئے اور خلافت سے سرفراز ہوئے۔ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

تعریف صادق نہیں آتی بلکہ اس کی حیثیت ''قرض جر نفعا'' کی ہے، یہ الگ بات ہے کہ یہ رقم مفادات عامہ پر خرچ ہو یا مزید قرض دینے کے کام میں لایا جائے، کوئی بھی سودی قرض دینے والا اپنے شرائط پر اور اپنے مقرر کردہ شرح سود پر قرض خواہوں کو قرض دیتا ہے، بالفرض اگر وہ سودی قرض سے حاصل ہونے والے منافع کو مفاد عامہ پر ہی صرف کرے پھر

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) دیوبند سے فراغت کے بعد غالباً ۱۹۵۲ء سے مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں تدریس کا آغاز کیا، پھر تھوڑے دنوں کے بعد حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی کے ایماء پر جامعہ خانقاہ رحمانی مونگیر منتقل ہو گئے، اور تقریباً بارہ سال درس وتدریس کی خدمت کے ساتھ ساتھ امارت شرعیہ کے فتاوی بھی تحریر فرماتے رہے، پھر کسی وجہ سے وہاں سے علاحدگی اختیار کر لی، ''۱۹۵۷ء میں مولانا منت اللہ رحمانی نے امارت شرعیہ بہار کا دارالافتاء مختلف وجوہ سے مونگیر منتقل کر دیا تھا اور مفتی محمد یحییٰ قاسمی کو مفتی کے منصب پر فائز فرمایا تھا، آپ نے ۱۹۶۷ء تک مسلسل گیارہ سال یہ خدمت انجام دی، آپ کی نظر فقہی جزئیات پر اچھی تھی''۔ (ملاحظہ ہو: امارت شرعیہ، دینی جدوجہد کا روشن باب، ص ۱۷۷، مؤلفہ مفتی ظفیر الدین مفتاحی)۔

خانقاہ سے علاحدگی کے بعد احمد آباد گجرات، پھر موتیہاری میں امامت کی خدمت انجام دی، اس طرح کئی مقامات پر امامت وغیرہ کرتے رہے پھر ایک سال کے لئے جماعت میں نکل گئے، دو تین چلہ کے بعد حضرت جی مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ نے مفتی صاحب کو مرکز میں قیام کا مشورہ دیا اور چند کتابیں شرح وقایہ اور نور الانوار وغیرہ ان کے ذمہ کر دی، آپ کے اس زمانہ کے تلامذہ میں مولانا محمد سعد کاندھلویؒ ہیں، سال مکمل کرنے کے بعد گھر آ گئے اور چند ماہ بعد پھر مدرسہ امدادیہ دربھنگہ میں ۱۹۷۸ء تا ۱۹۸۰ء تین سال تدریسی خدمت انجام دی، وہاں سے علاحدہ ہو کر جامع العلوم پٹکاپور، کان پور، پھر مدرسہ شاہی مراد آباد پھر وہاں سے دارالعلوم حیدر آباد تشریف لے گئے اور دس سال قیام فرمایا، آپ کے ذمہ ترمذی شریف وغیرہ کی تدریس اور افتاء کی خدمت تھی، اسی دوران چند سال دارالعلوم سے علاحدہ بھی رہے اور دارالعلوم آگرہ میں ایک سال قیام فرمایا، پھر دارالعلوم حیدر آباد سے دوبارہ علاحدہ ہونے کے بعد گھر پر تقریباً بارہ سال قیام کرنے کے بعد ۲۰ر جمادی الاولی ۱۴۳۳ھ مطابق ۱۳ر اپریل ۲۰۱۲ء جمعہ کی شب میں انتقال فرمایا، اللہم اغفرلہ وارحمہ۔

آپ کے ممتاز تلامذہ میں مولانا قاضی محمد قاسم مظفر پوری، مولانا قاضی محمد عمران بالا ساتھ اور مفتی عبد السلام، مولانا محمد اسلم اور مولانا محمد اشرف عالم وغیرہم ہیں۔

تلاش بسیار کے بعد برادرم ڈاکٹر وقار الدین لطیفی ندوی کے ذریعہ مفتی صاحب کے کسی صاحبزادہ سے صرف اتنی ہی معلومات حاصل ہو سکیں جو میں نے اپنے انداز میں مرتب کر دی۔ (رحمت اللہ)

بھی اسے سود کی تعریف سے خارج نہیں کیا جاسکتا، ٹیکس کی تعریف میں (ماہرین) معاشیات جو بھی الفاظ استعمال کریں، یہ طے ہے کہ ٹیکس براہ راست کسی شئ کا معاوضہ نہیں ہوتا۔ ثانیا: یہ کہ جو لوگ حکومت کی مقررہ کردہ شرائط پر پورے اتریں انہیں بہر حال ٹیکس دینا ہوگا بخلاف قرضخواہ کے، کہ اسے اختیار ہوگا کہ وہ چاہے سودی قرض لے کر اپنی ضرورتوں کو پورا کرے یا ایسا نہ کرے، بہر حال ٹیکس کی تعریف میں جو اختیار کا فقدان ہے اس کی بہ نسبت سودی قرض میں اختیار بہت حد تک موجود ہے اور یہ کہنا کہ جس طرح سودی قرض لے کر مدیون اپنے اختیار سے اپنے اوپر سود کو لازم کر لیتا ہے اسی طرح ٹیکس دینے والا ٹیکس کی شرائط کے مطابق دولت حاصل کر کے اپنے اختیار سے اپنے اوپر ٹیکس کو لازم کر لیتا ہے، میرے خیال میں قیاس مع الفارق ہے، اس لئے کہ اولاً: تو یہ ضروری نہیں کہ دولت کسی شخص کو اس کے اختیار اور ارادہ سے حاصل ہو، (وراثت وغیرہ کی نظیر موجود ہے) ثانیا: جو لوگ حصول دولت کے لئے کسب اور جدوجہد کرتے ہیں ان کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ دولت مند ہو بھی جائیں، ثالثا: جس وقت کوئی حصول دولت کی جدوجہد شروع کرتا ہے، اس وقت اس کے ذہن میں کمتر ہی ٹیکس کا تصور ہوتا ہے بخلاف سودی قرض کے، جہاں ابتداء اور براہ راست قرض لیتے ہی اسے سود تسلیم کر لینا پڑتا ہے اور اس طرح وہ بالارادہ سود کی ادائیگی کا ارتکاب کرتا ہے، اس لئے میرے خیال میں صورت زیر بحث میں ٹیکس کی خصوصیات کا فقدان ہے لہذا اسے ٹیکس کی حدود میں داخل نہیں کیا جاسکتا بلکہ اسے دوسری قسم ہی میں داخل کرنا ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ کس ملک میں اس پر ربوا شرعی کی تعریف صادق آئے گی اور کہاں نہیں؟ جس ملک کا اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ ہے، اس ملک میں تو یہ یقیناً سود ہے، اب اس سود کا ادا کرنا کیا مسلمانوں کے لئے جائز ہے یا نہیں؟ اس کے لئے دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے کبھی کسی حال میں سود دینے کی گنجائش دی ہے یا نہیں؟

ہر صاحب علم جانتا ہے کہ حالت اضطرار میں محرمات قطعیہ کا استعمال جائز قرار دیا

گیا، اب یہ بحث الگ ہے کیا اس کے لئے محرمات قطعیہ کی حرمت ہی حالت اضطرار میں ختم ہو جاتی ہے یا حرمت رہتے ہوئے صرف اثم ختم ہو جاتا ہے؟

جب افراد کو حالت اضطرار میں محرمات کے استعمال کرنے کی اجازت ہے تو قوم جو افراد کے مجموعہ کا نام ہے، اسے کیوں اس کے استعمال کی اجازت نہ ہوگی؟ آج قوم کا کون فرد ہے جو اس حرام کے استعمال میں مضطر نہیں، کیا بدن کا کپڑا، کھانے کا غلہ، مصالحہ جات، روز بروز کے استعمال کی معمولی معمولی چیزیں، اس سود و قمار سے خالی ہیں؟ اور کیا ان کے استعمال کے بعد سود و قمار کی رقم ادا نہیں کرتے، دانستہ ہو یا نادانستہ ہر فرد بشر اس کا مرتکب ہے، اگر کوئی چاہے بھی تو اس وقت زندہ رہ کر اس سے بچ نہیں سکتا ہے وہ دنیا کے کسی خطہ کا رہنے والا ہی کیوں نہ ہو۔

ان حالات کے تحت اسلامی ممالک کے رہنے والے مسلمانوں کو ان معاملات میں شرکت کرنے اور قرض لے کر اپنی ضروریات پورا کرنے کی اجازت ہے مگر اتنا ہی جتنی ان کی ضرورت ہو اور ضرورت سے زیادہ لینے پر عنداللہ باز پرس ہونے کا خطرہ ہے، اس لئے کہ سود دینا بھی بہر حال گناہ ہے، رہے ان ملکوں کے مسلمان جہاں اقتدار اعلی غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے، ان کے لئے مذکورہ بالا وجوہ اور مجبوری کے ساتھ ایک بات یہ بھی دیکھنے کی ہے کہ وہاں ربا کی تعریف شرعاً صادق آتی بھی ہے یا نہیں؟

ربا کے تحقق کے لئے جہاں اور شرطیں ہیں ایک شرط یہ بھی ہے کہ عاقدین کا مال معصوم و متقوم ہو، علامہ ابن عابدین شامی حاشیہ درمختار میں فرماتے ہیں:

"قال فی الشر نبلالية: ومن شرائط الربا عصمة البدلين وكونهما مضمونين بالإتلاف، فعصمة أحدهما وعدم تقومه لا يمنع، فشراء الأسير والتاجر مال الحربي أو المسلم الذي لم يهاجر بجنسه متفاضلا جائز" (در المختار باب الربو ج ٤ ص ١٨٤)

اور جب عاقدین میں سے ایک کا مال معصوم ومتقوم نہ ہوتو پھر ربوا کا تحقق ہی نہ ہوگا جیسا کہ مبسوط سرخسی کی عبارت ذیل سے معلوم ہوتا ہے:

"وكذلك المسلم يبايع الحربى بذلك فى دارالحرب ثم أسلم الحربى وخرج إلى دارنا قبل التقابض، فإن خاصمه فى ذلك إلى القاضى أبطله، وإن كانا تقابضا فى دارالحرب ثم اختصما لم أنظر فيه، ويستوى إن كان المسلم أخذ الدرهمين بالدرهم أو الدرهم بالدرهمين لأنه طيب نفس الكافر بما أعطاه قل ذلك أو كثر، و أخذ ماله بطريق الإباحة كما قررنا، والله اعلم" (مبسوط، باب الصرف فى دار الحرب ج ١٤ ص٥٩، مطبعة السعادة بجوار محافظه مصر)۔

شاہ عبدالعزیز محدث قدس سرہ نے لکھا ہے:

''سوال۔سود دادن بحربیان درست است یا نہ؟

جواب: عبارات کتب فقہیہ عام واقع شدہ اند، دادن وگرفتن راشامل اند مثل ''لا ربوا بين المسلم والحربى فى دارالحرب'' وقاضی ثناءاللہ صاحب پانی پتی دررسالہ توجیہ دادن، سود نیز نوشتہ اندایں وقت فقیر را یاد نیست، لیکن ایں قدر ظاہر است کہ گرفتن سود از حربیان بایں وجہ حلال است کہ مال حربی مباح است، اگر درضمن آن نقض عہد نباشد وحربی چوں خود بخود بدہد بلاشبہ حلال خواہد بود، ودادن سود بحربیان بایں وجہ حلال است کہ خورانیدن حرام بمسلمانان درست نیست وآنہا حرام خوراند، اگر چیزے بطریق سود دادہ خواہد شد بیش ازیں نیست کہ حرام خواہد خورد، واما ذمیان ہر

چند کہ کافر حرام خوار باشند دردارالاسلام دادن سود ازیں جہت حرام است کہ ترویج معاملہ سود دردارالاسلام میشود ودردارالحرب ایں ہر دو علت مفقود است، پس مباح باشد وتحقیق اینست کہ دادن سود بالتبع حرام است کہ مال کسے نمی گیرد بلکہ مال خود میدہد ومال خود دادن گودران نقصان خود باشد خصوصا برائے دفع حاجت ودفع ظلم مباح است، پس وجہ حرمت دراں ہمیں دو چیز است: یکے آنکہ غیر را حرام میخوراند، مثل دادن رشوت بہ قاضی وحاکم، دوم آنکہ باعث ترویج ایں معاملہ دردارالاسلام میشود، ولہذا دادن سود بنابر اضطرار دردارالاسلام ہم جائز داشتہ اند، غرضکہ درگرفتن ودادن فرق بسیار است، گو دراصل وِزر ہردو شریک اند''۔ (فتاوی عزیزی۔ج۱۔ص۲۶۔۲۷، مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۲۲ھ)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

''ہرگاہ دارالحرب شدر باگرفتن ودادن بکفرہ آنجا جائز شد زیرا کہ در ہدایہ مذکوراست ''ولا ربوا بين المسلم والحربى فى دارالحرب'' وقاعدۂ مقرراست کہ ''الإطلاق فى الروايات نفى عن تعميمه'' پس ہر دو اخذ واعطاء درنفی داخل شد، لیکن مسلمان را باید کہ در دادن سود بحربی احتیاط کند بے ضرورت نہ دہد'' (فتاوی عزیزی۔ ج۱ ۔ص۳۲)

شاہ عبدالعزیزؒ نے جو حربی کو سود دینے میں احتیاط برتنے کی ہدایت فرمائی ہے غالبًا اس کی وجہ یہ ہے کہ جہاں ''لا ربوا بين المسلم والحربى فى دارالحرب'' کتب فقہ میں وارد ہے، اس کا تقاضا اطلاق اخذ واعطاء دونوں ہے لیکن جو دلیل کتب فقہ میں اس کی موجود ہے کہ ''لأن مالہ ثمۃ مباح'' اس کا تقاضا تقیید باخذ کا ہے، اعطاء کا نہیں ہے۔

محقق ابن ہمام سے علامہ شامی نے نقل کیا ہے:

"(قولہ لأن ماله ثمة مباح) (در مختار باب الربوا)۔
قال فی فتح القدیر "لا یخفی أنه إنما یقتضی حل مباشرة العقد، إذا کانت الزیادة ینالها المسلم، والربا أهم من ذلك، إذ یشمل ما إذا کان الدرهمان (أی فی بیع درهم بدرهمین) من جهة المسلم ومن جهة الکافر، وجواب المسئلة بالحل عام فی الوجهین، وکذا القمار، قد یفضی إلی أن یکون مال الخطر للکافر بأن یکون الغلب له، فالظاهر أن الإباحة تفید نیل المسلم الزیادة، وقد التزم الأصحاب فی الدرس أن مرادهم من حل الربا والقمار، ما إذا حصلت الزیادة للمسلم نظرا إلی العلة، وإن کان إطلاق الجواب خلافه، واللہ سبحانه وتعالی أعلم بالصواب"۔
(رد المحتار۔ ج۷، ص۴۲۳، دارالکتب العلمیة، بیروت، لبنان– فتح القدیر۶/۱۷۸، باب الربا، المکتبة الرشیدیة، کوئٹه، پاکستان)۔

ان تمام حوالوں سے یہ بات واضح ہوئی کہ دارالحرب کے رہنے والے مسلمانوں کو سود دینے کی گنجائش تو ہے لیکن احتیاط بہتر ہے لیکن آج کے دور میں مسلمانوں کا بغیر سود دئے ہوئے زندہ رہنا اور اپنی قوم اور نسل کو زندہ رکھنا مشکل ہے اور اس سود دینے میں وہ مضطر بھی ہیں اور مکرہ بھی، اس لئے ان حالات میں مسلمانوں کو اپنی ضرورت کے ماتحت حکومت سے روپئے قرض لے کر کاروبار چلانے کی گنجائش واجازت ہے اور امید ہے کہ مواخذہ نہ ہوگا۔

رہے وہ مفاسد اور نقصانات جو سوال میں درج ہیں، ان کا اعتبار شرعاً نہیں ہے اور اس کی وجہ دو ہے: ایک تو یہ کہ نقصانات نادر الوجود ہیں اور حکم شرعی غالب الوجود پر ہوا کرتا ہے، نوادر پر نہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ فرد کا ضرر قوم کے نفع کے لئے کیا جاتا ہے، جس کی نظیر یہ ہے کہ اگر حربی، مسلم تاجر یا اسیر کو مسلمان فوج کے نشانہ کے لئے ڈھال بنائے تو اس سے جنگ بند نہ کی جائے بلکہ جنگ جاری رکھی جائے، صرف نیت اس کی ضروری ہوگی کہ مقصد مسلمان کو مارنا نہیں ہے اور بس۔ یہاں بھی یہ حکم اس لئے نہیں دیا جارہا ہے کہ فرد کا نقصان ہو بلکہ اس لئے دیا جارہا ہے کہ قوم زندہ رہ سکے، ھذا ما عندی واللہ عندہ علم الکتاب۔

محمد یحییٰ قاسمی کان اللہ لہ
مفتی امارت شرعیہ بہار واڑیسہ
خانقاہ رحمانی، مونگیر

☆☆☆☆

جواب متعلق قرضہ از حکومت

منجانب مظاہر علوم، سہارنپور☆

حامدا ومصلیا ومسلماً اما بعد! یہ امر اہل علم پر مخفی نہیں کہ سود کی حرمت فرعی اور استنباطی نہیں بلکہ منصوص اور قطعی ہے، قال اللہ تعالی: "وحرم الربوا" تحریم ربو نازل ہونے پر بقایا سود کے وصول کرنے کی بھی ممانعت کردی گئی بلکہ اس کو بمنزلہ شرط ایمان قرار دیا گیا "وذروا ما بقی من الربوا إن کنتم مؤمنین" جو لوگ سود لینے سے باز نہ آئیں

☆ یہ تحریر مفتی عبدالعزیز رائے پوری (پ: ۱۹۳۰ء- ت: ۱۹۹۱ء) کی ہے، آپ کے والد ماجد مولانا بشیر احمد صاحب، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری کے جانثار خدام میں تھے، اور خانقاہ رحیمیہ میں قیام کی غرض سے اپنے وطن کو خیر باد کہہ کر رائے پور کو اپنا مسکن اور وطن ثانی بنالیا تھا، آپ جامع مسجد رائے پور کے امام وخطیب بھی تھے، مفتی عبدالعزیز صاحب کی ولادت ذی الحجہ ۱۳۴۷ھ مطابق مئی ۱۹۳۰ء میں موضع سنڈیر ضلع کرنال (ہریانہ) میں ہوئی، لیکن تعلیم وتربیت اور نشو ونما سب کچھ رائے پور ضلع سہارن پور میں ہوا، حفظ قرآن حافظ شبیر احمد مرزاپوری اور حافظ عظیم الدین عالم پوری کے پاس کیا، عربی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد مرحوم سے حاصل کی، پھر ۱۳۶۷ھ میں جامعہ مظاہر علوم میں داخلہ لیا اور کافیہ سے آخر تک تعلیم مکمل کی، ۱۳۷۳ھ میں دورۂ حدیث سے فراغت پائی، بخاری شریف، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، مسلم شریف، مولانا منظور احمد خاں، ترمذی شریف، مولانا مفتی سعید احمد صاحب اور ابوداؤد اور طحاوی، مولانا اسعد اللہ صاحب سے پڑھی، دورۂ حدیث میں آپ کے ممتاز اور مخصوص رفقاء میں مفتی منظور احمد جون پوریؒ (قاضی شہر کان پور) مولانا اطہر حسینؒ (سابق استاذ جامعہ مظاہر علوم) اور مولانا عبدالقیوم کان پوری (استاد حدیث ونائب مفتی وناظم تعلیمات جامع العلوم کانپور) ہیں۔

دورۂ حدیث سے فراغت پر آپ حضرت شیخ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ۱۳۷۴ھ (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ان سے اعلان جنگ ہے۔ "فإن لم تفعلوا فأذنو بحرب من اللہ ورسولہ" سودخوار کا حشر قیامت میں انتہائی عجیب اور بھیانک ہوگا "الذین یأکلون الربوا لا یقومون إلا

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) میں کان پور تشریف لے گئے اور وہاں ایک سالہ قیام میں درس نظامی کی مختلف کتابیں پڑھائیں، اور مفتی محمود حسن گنگوہی کی زیر نگرانی فقہ وفتاوی کی بنیادی کتابوں کا مطالعہ بھی کرتے رہے، ۱۳۷۵ھ میں جامعہ مظاہر علوم میں مزید ایک سال کے لئے کتب فنون میں داخلہ لیا، پھر ۱۳۷۶ھ میں آپ کا تقرر جامعہ ہی میں ہوگیا، ۱۳۸۰ھ تک یہ سلسلہ جاری رہا، پھر ۱۳۸۱ھ کا پورا سال خانقاہ رائے پور میں گذارا، ۱۳۸۲ھ میں رائے پور سے واپسی پر حسب سابق درس وتدریس اور شعبۂ دارالافتاء میں فتاوی نویسی میں مشغول ہوگئے، مختلف کتب کی تدریس انجام دیتے اور ترقی کرتے ہوئے دورۂ حدیث تک پہنچ گئے اور نسائی شریف وغیرہ کا درس دیا۔

مفتی صاحب کا روحانی تعلق حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری سے تھا، ان کی وفات کے بعد حضرت شیخ سے رجوع ہوئے اور اصلاح وتربیت اور سلوک وارشاد کی راہ میں اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے دیا، لیکن اجازت وخلافت حضرت مولانا محمد افتخار الحسن کاندھلوی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے حاصل تھی، ۱۳۷۷ھ میں پہلی بار منجانب مدرسہ پاکستان کا سفر فرمایا، اور چار ماہ بعد واپسی ہوئی، ۱۳۷۸ھ میں پہلی مرتبہ مدرسہ کی جانب سے بھوپال، مدارس، حیدرآباد وغیرہ کا سفر کیا اور ان علاقوں میں مدرسہ کا تعارف کرایا، ۱۳۸۲ھ میں پہلی مرتبہ دارالطلبہ جدید کے نگراں بنائے گئے، اور اسی سال ۱۳۸۲ھ میں آپ مسجد دارالطلبہ کے امام وخطیب مقرر کئے گئے، ۱۳۸۵ھ میں پہلی مرتبہ نائب مفتی کا عہدہ آپ کو دیا گیا، مظاہر علوم کے بحرانی دور میں مفتی مظفر حسین صاحب کو عہدۂ نظامت سے علاحدہ کرکے ان کی جگہ مفتی عبدالعزیز صاحب کو عارضی مسند نظامت پر بیٹھا دیا گیا، یہ واقعہ ۱۴۰۲ھ میں حضرت شیخ کی وفات کے بعد کا ہے، یہ زمانہ مظاہر علوم کے لئے سخت بحران وآزمائش کا تھا، لیکن مفتی صاحب انتہائی ثابت قدمی، استقلال اور پختگی کے ساتھ تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے رہے، ۱۴۱۰ھ (یکم مارچ ۱۹۹۰ء) میں حضرت مفتی صاحب کو مستقل ناظم مقرر کیا گیا۔

قرآنی مکاتب اور دینی مدارس کا قیام اپنا مقصد حیات اور زندگی کا مشن بنالیا، اور کم وبیش چالیس مدارس کے آپ بانی ونگراں اور ذمہ دار اعلی تھے، اور ان تمام مدارس کو ایک لڑی میں پرونے اور دینی تعلیم کو عام کرنے کے لئے ۱۴۰۰ھ میں ایک انجمن دعوت القرآن کے نام سے قائم فرمائی۔

مدرسہ فیض ہدایت رحیمی رائے پور ابتداء میں ایک مکتب کی شکل میں تھا، ۱۳۹۰ھ میں آپ اس کے مہتمم بنائے گئے، اب وہ علاقہ میں ایک مرکزی ادارہ کی حیثیت سے مشہور ہے۔

حضرت مفتی صاحب ہمیشہ صحت منداور تنومند رہے، قدرت نے آپ کو قابل رشک صحت عطا (بقیہ اگلے صفحہ پر)

کما یقوم الذی یتخبطه الشیطٰن من المس" سودخوار کے لئے سخت وعید آئی ہے: "یاأیها الذین آمنوا لا تأکلوا الربوا الی قوله تعالی۔ اعدت للکافرین"۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک میں سب سے زیادہ خوفناک یہ آیت ہے: "کان أبو حنیفةؒ یقول هي أخوف آیة فی القرآن حیث أوعد الله المؤمنین بالنار المعدة للکافرین إن لم یتقوه فی اجتناب محارمه" (تفسیر مدارک ۱/۱۴۱)۔ انسان کے بدن میں جو گوشت حرام مال سے پیدا ہو وہ نار جہنم ہی کے لائق ہے، سود کا ایک درہم جان بوجھ کر لینا چھتیس بار زنا کرنے سے بھی زیادہ شدید ہے، عن عبد الله بن حنظلة غسیل الملٰئکة قال: قال رسول الله ﷺ: "درهم ربا یأکله الرجل وهو یعلم، أشد من ستة وثلثین زنیة"۔ رواه أحمد (۱) والدارقطنی (۲) وروی البیهقی فی شعب الإیمان (۳) عن ابن عباس وزاد "من نبت لحمه من السحت فالنار أولی به"۔ (مشکوة، ج ۱ ۔ص ۲۱۵، فصل ثالث، باب الربا (حدیث: ۲۸۲۵)۔

سود لینے والے، سود دینے والے، سود کا رقعہ لکھنے والے، سود کی گواہی دینے والے، سب پر حدیث شریف میں لعنت آئی ہے اور سب کو نفس گناہ میں برابر قرار دیا گیا ہے، عن جابرؓ قال: "لعن رسول الله ﷺ آکل الربوا وموکله وکاتبه وشاهد یه، وقال: هم سواء"۔ (رواه مسلم ح: ۱۵۹۸، مشکوة ص ۲۴۴)۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) فرمائی تھی، لیکن زندگی کے آخری دو سال عوارض اور تکلیف دہ علالت میں گزرے، اوائل جنوری ۱۹۹۱ء میں افاقہ اور قدرے صحت یابی ہوئی، بالآخر ۲۶ر دسمبر ۱۹۹۱ء شب آٹھ بجے روح پرواز کر گئی، انا للہ وانا الیہ راجعون۔
پہلی نماز جنازہ ڈیڑھ بجے مولانا سید اسعد مدنی نے مدرسہ فیض رحیمی میں پڑھائی، دوسری نماز جنازہ خانقاہ میں مولانا محمد طلحہ صاحب نے ڈھائی بجے پڑھائی اور حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری کی قبر سے بائیں جانب چند گز کے فاصلے پر تدفین عمل میں آئی، آپ جامعہ مظاہر علوم کے ۱۹۸۶ء تا ۱۹۹۱ء تا حیات ناظم رہے۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: علماء مظاہر علوم اور ان کی علمی وتصنیفی خدمات ج ۴/ ۱۹۵-۲۰۵، اور تاریخ مظاہر علوم)۔

(۱) الإمام احمد فی المسند الکبیر ۵/ ۲۲۵۔ (۲) الدارقطنی ۳/ ۱۶، کتاب البیوع (۴۸)۔
(۳) ۴/ ۳۹۳-۳۹۴، باب فی قبض الید عن الأموال المحرمة (۵۵۱۸)۔

دور حاضر کے مسلمانوں کے لئے سودی قرض لینے کی جو احتیاج بیان کی گئی ہے ان سے کہیں زائد ان مسلمانوں کو ضرورت تھی جن کو مخاطب بنا کر سود حرام قرار دیا گیا ہے، وہ حضرات کفار کے قرضوں میں دبے ہوئے تھے، کفار ان کا خون چوس رہے تھے حتی کہ حضرت بلالؓ کو دوبارہ غلام بنانے کی دھمکی دی گئی تھی جس سے پریشان ہو کر قرض کی ادائیگی کا انتظام ہونے تک کے لئے باہر چلے جانے کا ارادہ کر لیا تھا، وہ حضرات بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھتے تھے، کئی کئی روز تک فاقہ کرتے تھے اور غش کھا کھا کر گر جاتے تھے، دو دو، تین تین مہینہ تک گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، کپڑا بھی پوری تن پوشی کے لئے نہیں ہوتا تھا، چادر ہے تو تہ بند نہیں، تہ بند ہے تو کرتا نہیں، نکاح کی خاطر مہر میں دینے کے لئے لوہے تک کی انگوٹھی میسر نہیں آئی، صرف ایک لنگی بدن پر تھی اس میں سے آدھی لنگی مہر میں دینے پر آمادہ ہوئے، بچوں کو بھوکا، روتا ہوا دیکھ کر تین چار دانے کھجور حاصل کرنے کے لئے یہود کی مزدوری کرنا پڑی۔ خود آنحضرت ﷺ کو ازواج مطہرات کے نفقہ کے لئے اپنی، جہاد میں کام آنے والی زرہ یہودی کے پاس رکھنے کی نوبت آئی، اسی حال میں آپ کا وصال ہوا۔

ان حالات کے باوجود ان حضرات کو کفار کے مال ودولت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کو بھی منع فرمایا گیا: "ولاتمدن عینیك إلی ما متعنا به أزواجا منهم زهرة الحیوٰة الدنیا لنفتنهم فیه ورزق ربك خیر وأبقی" (طه: ۱۳۱) نیز مال میں کفار کی حرص کو بھی منع فرمایا ہے: "فلا تعجبك أموالهم ولا أولادهم، إنما یرید الله لیعذبهم بها۔ الآیة" (توبه: ۵۵) مگر اسی کو آج مسلمان بار بار للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے اور ان ہی کی روش پر چلتا اور چلنے کے لئے راہیں تلاش کرتا ہے، سودی کاروبار کے ذریعہ نہ مسلمان کا مال ترقی کر سکتا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: "إن الربا وإن کثر، فإن عاقبته تصیر إلی قُلّ" (تخریج المسند: ح: ۳۷۵۴، أخرجه ابن ماجه: (۲۲۷۹)، أحمد: (۳۷۵۴)۔ اور نہ اس کا مال محفوظ رہ سکتا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے "یمحق الربوا"۔

لہذا سودی کاروبار کو مسلمان کی عزت اور وقار کی حفاظت یا ترقی کا ذریعہ تجویز

کرنا،نصوص قرآن وحدیث کا مقابلہ کرنا ہے،مسلمان کی ترقی اور کامیابی اتباع شریعت اور حرام وحلال کی تمیز کے بغیر مال جمع کرنے اور تجارت کو فروغ دینے، باغات اور مکانات کی تعمیر میں ہرگز نہیں بلکہ اس کی ترقی اور کامیابی احکام شریعت کی پابندی میں ہے،حرام اور لعنت کے کاموں سے پوری طرح پرہیز کرنے میں ہے۔جب معاشرہ بگڑ چکا ہو، غیر قومیں حرام مال سے ترقی کی راہ پر گامزن ہوں،تو علماء کا یہ کام نہیں کہ مسلمانوں کے لئے بھی جواز کی راہ نکال کر ان غیر قوموں کی اتباع کا فتوی دے دیں بلکہ ان کی ذمہ داری ہے کہ رضاء خداوندی اور ابدی انعامات کا پورا نقشہ قوم کے سامنے اخلاص اور قوت کے ساتھ پیش کر کے متعین طور پر بلا کسی تذبذب کے حکم خداوندی سنا دیں،اگر کوئی شخص مستامن وغیرہ،مخصوص حالات میں کسی بلا میں گرفتار ہو جائے تو اس کے لئے شرعی اسباب کے پیش نظر کسی قول پر کوئی گنجائش نکل سکتی ہو،تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس کو عام ضابطہ بنا کر منہی عنہ کو ختم کر دیا جائے،اگر بگڑے ہوئے معاشرہ اور دیگر اقوام کی ترقیات سے متاثر ہو کر مسلمان کے لئے حرام کی راہیں کھول دیں تو اس کا انجام نہایت خطرناک ہے،علماء بنی اسرائیل نے اول قوم کو معاصی سے روکا، وہ نہیں رکی تو روکنا چھوڑ دیا اور پھر معاشرہ میں قوم کے ساتھ شریک ہو گئے،تو سب پر لعنت کی گئی۔

اس تمہید کے بعد مختصر طور پر جوابات معروض ہیں:

(۱) جہاں تک ہم نے شرعی قواعد وضوابط اور فقہی تصریحات کے پیش نظر غور وخوض کیا، معلوم یہ ہوا کہ یہ رقم سود ہے،ٹیکس نہیں ہے،جس کی وجوہ حسب ذیل ہیں:

(الف) آمدنی کے مقدار مقررہ پر پہونچنے کے بعد حکومت اپنی شرح کے مطابق ٹیکس جبراً وصول کرتی ہے،اور یہ بات کہ ملکیت کا بڑھانا ہی اپنی اختیاری چیز ہے، یہ ٹیکس کو جبری ہونے سے نہیں روکتی،اس لئے کہ بسا اوقات آدمی ترکہ میں غیر اختیاری طور پر کثیر مقدار کا مالک ہو جاتا ہے جس سے حکومت جبراً ٹیکس وصول کر لیتی ہے۔ برخلاف سود کے کہ یہ قرض لینے کی وجہ سے دینا پڑتا ہے اور معاملۂ قرض قانونی

حیثیت سے جبری نہیں بلکہ اختیاری ہے،اگر قرض لیتی ہے تو حکومت سود لینے کی مجاز ہے ورنہ نہیں، رہی یہ بات کہ حکومت کے پاس جو روپیہ ہے وہ پبلک کا ہے، اس کا اپنا نہیں،لہٰذا عاقد کی ملک نہ ہونے کی وجہ سے اس کو حدر بوا سے خارج کر دیا جائے، درست نہیں ہے، کیوں کہ حکومت نے جب روپیہ (مسلم) پبلک سے وصول کر لیا تو اس روپیہ پر استیلاء ہو گیا، جس کی وجہ سے حکومت اس کی مالک ہو گئی، چنانچہ اسی وجہ سے حکومت اپنی صوابدید کے مطابق جہاں چاہتی ہے خرچ کرتی ہے، پھر اس کو پبلک کا روپیہ قرار دینا خلاف بداہت ہے۔

(ب) فقہاء نے تصریح کی ہے کہ جو حقیقی یا حکمی زیادتی معاوضات میں بدون عوض مشروط ہو،وہ سود ہے، "وهو فی الشرع عبارة عن فضل مال لا يقابله عوض فی معاوضة مال بمال" (عالمگیری، کذا فی تفسیر الآلوسی ۳/ ۴۸ کتاب البیوع الفصل السادس من الباب التاسع فی تفسیر الربا وارکانہ ص: ۱۱۷، دار صادر، بیروت)، یہ تعریف مسئولہ صورت پر صاف طور پر صادق آ رہی ہے کیونکہ مستقرض حکومت سے عقد قرض کرتا ہے اور مقدار قرض سے زیادہ ادا کرنے کا التزام کرتا ہے اور اس زیادتی کے مقابلہ میں کوئی عوض نہیں ہے لہذا شرعاً اس کے سود ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے،ممکن ہے اس پر یہ شبہ کیا جائے کہ سود کی تعریف میں فقہاء نے معاوضات کی قید ذکر کی ہے اور قرض معاوضات میں داخل نہیں بلکہ اعارہ اور صلہ ہے،مگر اس کا جواب بھی فقہاء کی تصریحات سے ظاہر ہے: "فی الشامی: إن القرض إعارة ابتداء حتى صح بلفظها، معاوضة انتهاء،(فصل فی القرض: كتاب البيوع: ۲۸۸، كذا فی الموسوعة الفقهية ج ۳٤/قضاء الحاجة- كفالة) ونحوه فی الطحاوی" علامہ کاسانی ایک مقام پر بحث کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:" (ظاهر الرواية) أن الإقراض فی الحقيقة مبادلة الشيئ بمثله" (بدائع الصنائع، ج ۵/۱۳۴، مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ، پاکستان، ط ۱۹۱۰ء)

معلوم ہوا کہ قرض ابتداء گو اعارہ ہے مگر انتہاء معاوضہ ہے، اس لئے اس کو معاوضات سے خارج نہیں کیا جاسکتا۔

(ج) حدیث میں ” کل قرض جرّ نفعا فھو ربوا“(فتاوی اسلامیہ،ج ۲/ ۴۱۷،مجموعہ فتاوی ومقالات للشیخ ابن باز،۱۹/ ۲۹۳،حدیث ضعیف ہے لیکن مفہوم صحیح ہے،مزید تفصیل کے لئے کتاب فقہ التاجر المسلم ص ۱۲۹ دیکھیں،حسام الدین عفانۃ) وارد ہے اور فقہاء نے بھی اس کی تصریح فرمائی ہے اور اس کے تحت مختلف جزئیات بھی ذکر فرمائی ہے، یہ بھی صراحۃ اس امر پر دال ہے کہ زائد رقم سود میں داخل ہے۔

(د) قرض میں زیادتی کی شرط بالا جماع حرام ہے اور ربوا میں داخل ہے، عمدۃ القاری میں ہے:”قد أجمع المسلمون بالنقل عن النبیﷺ أن اشتراط الزیادۃ فی السلف ربا“ ۔(عمدۃ القاری ۸/ ۵۵۶،کتاب البیوع،باب بیع العبید والحیوان بالحیوان نسیئۃ (۱۰۸)،زکریا بکڈپو،دیوبند)

(۲،۳) عقود ربویہ اور معاملات محرمہ کو جاری اور شائع کرنا اشاعت فاحشہ ہے جس کی مسلمان کے لئے کہیں بھی اجازت نہیں اور بالخصوص جس جگہ اقتدار اعلی مسلم کو حاصل ہو وہاں پر اولوالامر کے ذمہ فاحشہ اور اشاعت فاحشہ سے جبرا وقہرا روکنا لازم ہے اور جو لوگ غریب اور نادار ہیں حکومت کے ذمہ لازم ہے کہ ان کی ضروریات کومہیا کرنے کی کوشش کرے، پبلک کے ذریعہ چندہ جمع کرا کر یا خزانۂ حکومت سے، اور پبلک کوسود لینے اور دینے سے روکے، اور جہاں اقتدار اعلیٰ غیر مسلم کو حاصل ہو وہاں بھی جمہور علماء کے قول کی بنا پر کوئی فرق نہیں اور سود لینا اور دینا دونوں حرام ہیں جس کی تفصیل کتب فقہ میں موجود ہے، ہاں! البتہ اگر کسی شخص کی جان اور عزت خطرہ میں پڑ جائے اور کسی جگہ سے بلاسود کے قرض ملنا ممکن نہ ہو تو ایسے وقت میں بعض علماء کے قول پر بقدر ضرورت حکومت یا غیر حکومت سے قرض لینے کی گنجائش ہے: ”لأن الضرورات تبیح المحظورات وما أبیح للضرورۃ

یتقدر بقدرھا“ (الأشباہ لابن نجیم،ج ۱/ ۲۵۱-۲۵۲) اشباہ میں ہے: ” ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح“ (قاعدہ خامسہ کا چھٹا قاعدہ،ص ۲۶۷) لیکن اس گنجائش کو قاعدہ کلیہ بنا کر شائع نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ عوام ضرورت شرعیہ کی حدود کی پابندی نہیں کر سکتے۔تزیین اور تکثیر اموال کے لئے سودی قرض کی کوئی گنجائش نہیں۔فقط

عبدالعزیز رائے پوری عفی عنہ
دارالافتاء مدرسہ عربیہ مظاہر علوم
سہارنپور ۸/ صفر ۱۳۸۶ھ
تصدیق: مولانا یحییٰ(۱) غفرلہ

---

(۱) مفتی محمد یحییٰ (پ:۱۹۲۲ء-ت:۱۹۹۶ء) مولانا حکیم محمد ایوب صاحب کے سب سے بڑے فرزند تھے، ولادت ماہ ربیع الاول ۱۳۴۱ھ مطابق نومبر ۱۹۲۲ء میں ہوئی، والدہ ماجدہ نے حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کا ایک مستعمل کرتا منگوایا تھا جو عرصہ تک آپ کو پہناتی رہیں، ۱۹۳۶ء میں حافظ منظور احمد صاحب کے پاس حفظ مکمل کیا، درس نظامی کی ابتدائی کتابیں خارج میں مختلف اساتذہ سے پڑھ کر ۱۳۶۰ھ میں مظاہر علوم میں داخلہ لیا اور ۱۳۶۴ھ-۱۳۶۵ھ میں دورۂ حدیث شریف کیا، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، مولانا عبداللطیف صاحب، مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری، مولانا منظور احمد خاں صاحب، مولانا عبدالشکور اور مولانا اسعد اللہ صاحب آپ کے اساتذہ ہیں، مفتی محمود حسن گنگوہی سے خارج میں استفادہ کیا، فراغت کے بعد حضرت مفتی سعید احمد اجراڑوی سے بعض کتب افتاء پڑھ کر حضرت مفتی محمود حسن گنگوہی سے افتاء کی مشق وتربیت حاصل کی اور ہر دو حضرات سے تاحیات بھرپور استفادہ کیا۔

فراغت کے بعد سے ۱۳۷۴ھ تک مدرسہ خلیلیہ شاخ مظاہر علوم میں پڑھایا اور پھر ۱۳۷۵ھ میں معین مفتی کی حیثیت سے منتقل ہو کر مظاہر علوم آگئے، اس کے بعد فتاوی نویسی کے علاوہ مختلف کتابیں کنز الدقائق، شرح وقایہ، نور الانوار، ہدایہ اولین وآخرین آپ کے زیر درس رہیں، تین سال مشکوۃ پڑھا کر ۱۳۹۱ھ میں دورۂ حدیث کے استاد بنائے گئے اور سنن نسائی آپ کے زیر درس رہی، تین سال کے بعد طحاوی شریف آپ سے متعلق ہوگئی جو تادم آخر آپ ہی کے زیر درس رہی، گویا تیس سال تک حدیث شریف کا درس دیا۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

جواب مفتی نظام الدین صاحبؒ

جواب وضمیمہ وباللہ التوفیق

سوالنامہ مع ضمیمہ بغور پڑھا، سوالنامہ کا حاصل یہ ہے کہ حکومت وقت ترقیاتی اسکیم

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) اللہ تعالی نے حضرت مفتی صاحب کو بہت سے علوم سے نوازا تھا، خصوصاً حدیث وفقہ میں آپ کا اشتغال تسلسل کے ساتھ آخر حیات تک رہا، کتب فتاوی کی عبارتیں آپ کو ازبر تھیں، فتاوی کے اندر وہی طرز اور طریقہ اختیار کرتے جو اکابر مظاہر علوم اور خود مظاہر علوم کا طرۂ امتیاز تھا، آپ کے لکھے ہوئے فتاوی کی تعداد دو لاکھ بتائی جاتی ہے، بعض نے محتاط انداز کے مطابق چالیس ہزار سے زائد کہا ہے، علم وعمل، تقوی وطہارت اور امانت ودیانت میں نمونۂ اسلاف تھے، اتباع شریعت کا اہتمام فرماتے، سادگی وپاکیزگی، تواضع وانکساری، رحم دلی اور صلہ رحمی جیسی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے، وقت، نظام اور معمول کے بڑے پابند تھے، تکبیر اولی کے ساتھ نماز باجماعت کا اہتمام، تلاوت قرآن، اوراد ووظائف، دورد شریف اور ادعیہ ماثورہ کی بڑی پابندی کرتے تھے۔

آخری عمر میں بہت سی بیماریاں لاحق ہوگئی تھیں، بے خوابی اور کثرت بول کا عارضہ بھی تھا، لیکن شعبان ۱۴۱۵ھ میں بیماری کا سلسلہ شروع ہوا تو بڑھتا اور لاعلاج ہوتا گیا، اور بالآخر جان لیوا ثابت ہوئی، ۲۸ر رجب ۱۴۱۷ھ مطابق ۲۰ر فروری ۱۹۹۶ء بروز بدھ ۲ر بجے مالک حقیقی سے جاملے، عمر ۷۶ر سال پائی، نماز جنازہ مولانا زبیر الحسن صاحب (مرکز نظام الدین) نے دارالطلبہ جدید کے وسیع صحن میں ساڑھے آٹھ بجے شب میں پڑھائی، آبائی قبرستان میں والدین کے بغل میں تدفین ہوئی۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: ماہنامہ مظاہر علوم خصوصی نمبر اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۵ء)۔

مفتی محمد یحیٰی صاحب کے رفقاء درس میں مفتی عبدالقدوس رومی، قاری سید صدیق احمد باندوی، مفتی محمد وجیہ صاحب ٹانڈوی، (مقیم حیدرآباد، سندھ) اور مولانا حکیم محمد ہارون صاحب سہارن پوری ہیں۔

بیعت وارشاد کا تعلق حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی سے تھا، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری، حضرت شیخ الحدیث سے آخر تک استرشاد واستفادہ کا تعلق رہا، حضرت تھانوی سے عقیدت وعظمت بچپن سے تھی۔ (ایضا مضمون مفتی عبدالقدوس رومی مظاہری)۔

مفتی محمد یحیٰی قاسمی صاحب نوراللہ مرقدہ میرے رفیق درس مولانا معاذ احمد کاندھلوی ندوی (صدر شعبۂ عربی مظاہر علوم) کے نانا اور حضرت مولانا سید سلمان مظاہری (سابق ناظم اعلی جامعہ مظاہر علوم جدید) کے والد بزرگوار تھے۔ (رحمت اللہ)

کے تحت جو رقم قرض کے نام پر اپنی رعایا کو دیتی ہے اس پر زائد رقم یا نفع اتنا کم لیتی ہے جو نفی کے برابر ہوتا ہے، بسا اوقات حکومت کو اس پر خسارہ بھی برداشت کرنا ہوتا ہے، اس میں کسی قسم کی زرکشی یا زراندوزی، یا ذخیرہ خیزی وغیرہ جو عام طور سے مہاجنوں یا سود کا کاروبار کرنے والوں کے پیش نظر ہوتی ہے نہیں ہوتی، اس لئے یہ قرض سودی نہ ہوا اور مسلمانوں کو بھی اس کا لینا درست ہونا چاہئے۔

اور اگر سود کا احتمال ہو تو ٹیکس شمار کرکے یا حکومت کے حقوق عامہ جو رعیت پر ہوتے ہیں ان کے تحت لاکر یا کسی اور فقہی تاویل سے یہ قرض لینا اور ان اسکیموں میں مسلمانوں کا شریک ہونا جائز و درست ہوسکتا ہے، تاکہ مسلمان بھی ان سے مستفید ہوکر اقتصادیات سے پیچھے نہ رہیں۔

سوالنامہ سے انہی امور کی شرعی تحقیق مقصود ہے کہ آیا واقعی ان امور کی گنجائش شرعا ہے یا نہیں؟ اصل سوالنامہ کے اندر جواب طلب امور کا جہاں تک تعلق ہے ان سب کا تقریبا مفصل جواب احقر کے ایک فتوی مکتوبہ میں آچکا ہے جس کا حاصل بحذف تمہید ودلائل فقہیہ یہ ہے کہ سود (ربوا) کا ایک مفہوم شرعی ہے جس کو حقیقت شرعیہ کہہ سکتے ہیں اور اس کی حرمت متعدد آیات واحادیث میں نہایت شدومد سے مصرح ومنصوص ہے، اور اس کے ارتکاب کرنے والوں پر بڑی سخت سخت وعیدیں وارد ہیں اور یہ حرمت ایک ضابطہ وقانون کی شکل میں نازل ہوچکی ہے، اور یہ قانون (حرمت ربوا) اس بادشاہ کا قانون ہے جو تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے، اور تمام قانون بنانے والے دماغوں کا بنانے والا ہے، بلکہ تمام کائنات عالم کا تخلیق کرنے والا ہے اور مالک ہے، اور تمام گذشتہ وموجودہ اور آئندہ کے بھی تمام منافع ومضار پہلو وحیثیت سے اس کے سامنے ہمہ وقت متحضر ہیں۔

دنیا کی کوئی حکومت یا قانون بنانے والی کوئی جماعت یا بڑے سے بڑا دماغ خواہ کتنا ہی مکمل ومنضبط اور اپنے خیال میں کتنا ہی جامع ومانع قانون بنائے وہ اس احکم الحاکمین اور وحدہ لاشریک لہ کے بنائے ہوئے قانون جیسا مکمل ومدلل وجامع ومانع ونافع نہیں

ہوسکتا۔

جب اس نے یہ مکمل قانون (ربوا کی حرمت مطلقہ کا) بنا کر دنیا کو اس کے خلاف نہ کرنے کا حکم قطعی دے دیا اور ایسے وقت میں اس کو نافذ بھی کر دیا کہ وہ وقت آج کے وقت سے کہیں زیادہ سخت اور قابل لحاظ و رعایت تھا اور اس کی حرمت بھی صاف صاف اور کھلے لفظوں میں بیان کر دی، بلکہ جاہلیت (زمانۂ پیشین) کے جتنے ربوا تھے، سب کو یک لخت ختم ونسیاً منسیاً کر دیا، اور دنیا نے اس قانون کا امتثال کر کے اور بار بار اس کا تجربہ کر کے نفع بھی دیکھ لیا تو اب اس قانون الٰہی کے مطابق سود (ربوا) کا مفہوم جب کسی معاملہ پر صادق آجائے گا تو اس کو کسی طرح بھی جائز یا مباح نہیں کہا جائے گا، بالکل اسی طرح جب تک کسی معاملہ پر ربوا (سود) کی شرعی تعریف صادق نہ آجائے گی محض لوگوں کے ربوا کا نام رکھ دینے سے کبھی اس کو حرام، ناجائز یا ربوا نہ کہا جائے گا۔

بس اسی قاعدہ کے مطابق اس زائد رقم یا نفع کے تقریباً ہر شق کا جواب تفصیل کے ساتھ احقر کے سابق کے جواب (مکتوبہ ۲۴/۱۱/۱۳۸۸ھ) میں جو آچکا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تمہید و دلائل فقہیہ کو حذف کر کے صرف اس زائد رقم کا تفصیلی حکم یہاں لاحق کر دیا جائے پھر ضمیمہ کا جواب لکھا جائے، البتہ سوالنامہ میں بعض زائد باتیں ہیں ان کے جواب کا اضافہ بھی یہاں کر دیا جائے تاکہ بات ہر پہلو سے پکی ہو کر سامنے آجائے اور جن صاحب کو مزید دلائل وغیرہ دیکھنا ہو وہ اس اصل جواب کو بھی دیکھ لیں۔ اس تمہید کے بعد اس زائد رقم کا تفصیلی حکم پیش ہے:

(ا) اس زائد رقم پر جس کو حکومت قرض لینے والوں سے وصول کرتی ہے ٹیکس کی تعریف صادق نہیں آتی، لیکن اس کو علی الاطلاق سود کہنا بھی ضروری نہیں، بلکہ اس میں تفصیل ہوگی، اور وہ یہ ہے:

(الف) اگر محض نقد روپیہ بطور قرض کے لیا جائے اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے یا سامان وغیرہ کے ساتھ ہی نقد بھی لیا جائے مگر نقد کی وہ مقدار سامان سے کام

چلانے کی مقدار سے بہت زیادہ ہو اور اس پر نفع دینے کا معاملہ کیا جائے اور واپسی کی کل رقم، کل رقم یا فتنی سے زیادہ ہو جائے تو سود کی تعریف (هو فضل خال عن العوض لأحد المتعاقدين فی عقود المعاوضة) صادق آجائے گی، اور چونکہ معاملہ نقدین میں اور خالص مبادلہ اور عوض معاوضہ کا ہوا اس لئے وہ نفع کم ہو یا زیادہ، سود ہی ہوگا، اور "كل قرض جرنفعا فهو ربوا" بھی صادق آجائے گا۔ اس لئے حتی المقدور اس کے قریب بھی جانا جائز نہ ہوگا، اور مجبوری کا حکم دوسرا ہوگا، جو اس جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے۔ "ويجوز للمحتاج الاستقراض بالربح" (الأشباه والنظائر مع شرح الحموی ص ۲٦۷)۔

اسی قاعدہ کے تحت احتیاج شدیدہ کی حالت میں فقہائے امت سودی قرض کو بھی بقدر ضرورت کے لینے کی اجازت دے دیتے ہیں۔

(ب) جو نقد رقم سامان وغیرہ کے ساتھ محض کام چلانے کی مقدار میں لی جائے اس میں تاویل چل سکے گی اور اس کو کام چلانے کے لئے اعانت میں داخل کر کے اس معاملہ پر سودی معاملہ کا حکم نہ لگائیں گے اور اس زائد رقم کو سود نہ کہیں گے، بلکہ انتظامات کی درستگی کے لئے ایک قسم کی فیس میں داخل کہا جا سکے گا، اور اس صورت میں یہ معاملہ جائز رہے گا۔

(ج) مثلاً کسی نے پروجیکٹ (محکمۂ ترقیات کا ایک شعبہ) سے چار ہزار روپئے کنواں کھدوانے یا مکان بنوانے کے لئے یا کسی اور صنعت وحرفت کے لئے نقد لئے، اور محکمہ پروجیکٹ نے اس میں سے اپنے قاعدہ کے تحت ایک ہزار بالکل معاف کر دیا اور فقط تین ہزار قائم رکھ کر دو سال کا موقعہ دیا، پھر دو سال کی تاخیر کے بعد چھوٹی چھوٹی اور لمبی قسطیں ادائیگی کے لئے متعین کیا، اور اس میں ان قسطوں پر کچھ اضافہ کر کے وصول کیا مگر کل رقم وصولی کی چار ہزار (کل قرضہ) سے زائد نہ ہوئی تو اب ان قسطوں کے ساتھ جو زیادتی محکمہ نے وصول کی وہ سود نہ ہوگی، اور یہ معاملہ بھی

جائز رہے گا۔ چونکہ مجموعہ قرض چار ہزار تھا، اور چار ہزار پر زائد وصول نہیں کیا گیا کہ سود کی تعریف (فضل خال عن العوض الخ یا، کل قرض جر نفعا الخ) صادق آ سکے۔

(د) مثلاً محکمۂ اعانت وترقی میں مشین (ٹیوویل) لگانے کے لئے یا فیکٹری قائم کرنے کے لئے یا کوئی اور صنعت وحرفت یا کارخانہ چلانے کے لئے سامان لینے کی درخواست دی، محکمہ نے اپنے ایک شعبہ سے اس کار مقصود کے لئے اس کے مناسب حال نقد روپئے دے دئے اور سامان لینے یا خریدنے کے لئے اپنے دوسرے شعبہ کا تعین کر کے حکم کیا کہ اس فلاں (دفتر یا شعبہ) سے جو سامان درکار ہو خرید لو یا لیتے رہو۔ اس دوسرے شعبہ یا دفتر نے ارزاں قیمت پر باقساط وصولی کی شرط کے ساتھ سامان دے دیا یا حسب ضرورت دیتا رہا، اور پہلا شعبہ (محکمہ کا) ان قسطوں کی ادائیگی کے مطابق نقد روپئے قرض کے نام پر دیتا رہا اور اس لینے دینے میں محکمہ نے اپنا دیا ہوا روپیہ وصول کرتے ہوئے اپنے دیئے ہوئے روپیہ سے کچھ زائد وصول کر لیا تو اس زیادتی کا بھی سود ہونا ضروری نہیں۔

(ہ) اسی طرح ہر معاملہ جو اس قسم کے لین دین کا حکومت کے ان اعانتی محکموں سے ہو، اس میں غرض ومقصود کو سامنے رکھتے ہوئے اس زیادتی کی حیثیت پر غور کریں گے جب تک کوئی صحیح فقہی تاویل ملتی رہے گی اس کو ربوا (سود) کہنے سے اجتناب کریں گے اور خاص کر جب بجائے نقد کے محض سامان یا آلات وغیرہ ادھار دے کر اس کی قیمت مقررہ متعدد قسطوں کے ذریعہ وصول ہو تو اس میں امید ہے کہ کسی کو کوئی شبہ نہیں ہوگا۔

(و) اسی طرح وقت پر کسی ایک قسط یا متعدد تمام اقساط کے وصول نہ ہونے پر جو رقم زائد وصول ہوتی ہو اس کو بھی قاعدہ کے مطابق انتظامات کی درستگی باقی رکھنے کے لئے ایک قسم کی فیس میں داخل کر کے جائز کہا جا سکے گا، بالخصوص جب اس ہندوستان

جیسے ملکوں میں فقہائے محققین کا رجحان اس طرف ہے کہ بہت سے عقود فاسدہ میں بوجہ ابتلائے عام کوئی صورت توجیہ وتاویل کر کے حد جواز میں داخل کر لینے کی ہو تو داخل کر لینے کا توسع کیا جائے جیسا کہ تمہید میں پیش کردہ عبارتوں سے بھی واضح ہوتا ہے اور اس کے علاوہ بھی متعدد جزئیات امداد الفتاوی وغیرہ کی اس کی شاہد ہیں جیسے گائے بھینس وغیرہ کو چرائی پر دینے کی جزئیات، لیکن چونکہ بسا اوقات جب ادائیگی ثمن وقسط پر قدرت نہیں ہوتی تو بڑی خطرناک اور مضرت خیز شکلیں بھی سامنے آ جاتی ہیں جس سے عزت وآبرو، جان ومال سب خطرے میں پڑ جاتے ہیں جیسا کہ بعض شکلیں بسلسلۂ بیان نقصانات خود سوال میں بھی مذکور ہیں اور بہت سے لوگوں کا تجربہ ومشاہدہ میں بھی ہے، جس کا علم عام ہے اور بعض مرتبہ محررین و کارکنان محکمہ کی بے اعتنائیوں وشرارتوں کی وجہ سے برآمدگیٔ رقوم میں بے حد تعویقیں ودشواریاں پیش آ جاتی ہیں، یا رشوت خوروں کی وجہ سے حاصل شدہ رقم کا ایک معتد بہ حصہ انہی کی نذر ہو جاتا ہے اور وصول کرنے والا اس قابل نہیں رہتا کہ ترقی کر سکے بلکہ وقت پر ادائیگی وواپسی بھی بسا اوقات دشوار ہو جاتی ہے، اس لئے جہاں تک ہو سکے اس قسم کے معاملات میں پڑنے سے پرہیز ہی رکھنا ضروری ہے، بغیر شدید معذوری کے اس کے قریب بھی نہ جانا چاہئے۔

اور اگر اس کو سود ہی قرار دیا جائے جب تو اس سے اجتناب وپرہیز کا حتی المقدور ہونا ظاہر ہے، یہ تحقیق وتفصیل صحیح ہے یا غیر صحیح اس کا فیصلہ تو علمائے محققین اور مفتیان مدققین کریں گے، ان سب حضرات سے درخواست ہے کہ اصلاح یا بصورت تائید وتصویب مطلع فرمائیں، باقی اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ ہو یا غیر مسلم کے ہاتھ میں ہو، اس سے اس مسئلہ میں کچھ فرق واقع نہ ہوگا۔ اگر واقع ہوگا تو صرف اس قدر کہ جب اقتدار اعلیٰ مسلم کے ہاتھ میں ہوگا تو اس مسلم صاحب اقتدار پر ایسی صورتیں صاف اور واضح طور پر رائج کرنا ضروری ہوگا جن میں عدم ربوا کا یقین ہو اور کہیں

سے اس میں ربوا کا نام بھی نہ آنے پائے، اور ''**دعوا الربوا والريبة**'' (۱) کا پورا پورا مصداق ہو، اور اگر وہ صاحب اقتدار اس طرف متوجہ نہ ہو تو اس کے بعد والے اور کمتر درجہ والے صاحب اقتدار افراد حکومت پر درجہ بدرجہ حتی کہ عوام میں بھی جو صاحب اقتدار ہوں گے ان سب پر حسب حیثیت وقدرت اس اعلیٰ صاحب اقتدار کو اس طرف متوجہ کرنا اور اس پر عمل کے لئے آمادہ کرنا اور اس کے رواج دینے میں کوشش کرنا ضروری رہے گا۔

نوٹ: سابق جواب یہاں تک ختم ہوگیا۔ اس کے بعد کا اس وقت کا اضافہ ہے جو اس سوالنامہ کے پیش نظر لکھا گیا ہے۔

(۲) جس جس چیز پر سود کا مفہوم شرعی صادق آجائے گا اس کو والی یا حاکم عام کے حقوق خصوصی کی بنیاد پر مباح وجائز نہیں کیا جا سکتا خاص کر جن جن چیزوں کا حکم نص میں جس طرح آجائے اسی طرح اس کو رکھنا ضروری ہوجاتا ہے کہ یہی اصل دین ہے اور دین کے خلاف کسی کا بھی حکم ہو معتبر نہیں۔ لقوله تعالیٰ: "ومن يبتغ غير الإسلام دينا فلن يقبل منه الآية" (آل عمران: ۸۵) اور اسی وجہ سے ایسی تمام چیزیں حکام وشاہان دنیا کے دسترس سے بلند وبالاتر ہوتی ہیں حتی کہ اگر کوئی امیر یا والی عام ان نصوص کے خلاف کوئی حکم کر بھی دے تو وہ مداخلت بیجا اور مداخلت فی الدین ہوگی اور کسی بھی مسلمان کو اس کی موافقت یا اتباع درست ومباح نہ ہوگی، اس لئے کہ اس کی موافقت یا اتباع میں خالق کائنات ورب الارباب کی نافرمانی اور اس کی معصیت کا ارتکاب ہوگا اور یہ جائز نہیں۔ لقوله عليه السلام: "لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق"۔ (صحیح البخاری، کتاب المغازی (۴۳۴۰)، صحیح مسلم، کتاب الإمارة (۱۸۴۰)۔

(۳) الضرورات تبيح المحظورات میں الف ولام عہد کا ہے اور اس سے صرف وہ

(۱) یہ حضرت عمرؓ کا قول ہے، اور آیت ربا کے ضمن میں اکثر مؤلفین نے ذکر کیا ہے۔ (کتاب الجامع لعلوم الامام أحمد، الأدب والزهد، ص ۳۲۹)۔

ضرورتیں مراد ہیں جو ملجی یا منجر ہوں کیفیت اضطرار ومخمصہ کی جانب، جیسا کہ اس جملہ سے بالکل متصل اگلی عبارت "ومن ثم جاز أكل الميتة عند المخمصة" اس پر قرینہ ہے اور جس کو اسی قاعدہ کی وضاحت کے لئے مثال کے موقع میں خود مصنف (صاحب اشباہ) نے ذکر فرمایا ہے اور ''يجوز للمحتاج الاستقراض بالربح'' جو فرمایا گیا ہے، اس کا مقصود سود کو جائز کہنا نہیں ہے بلکہ صرف گنجائش دینا ہے، بایں معنی کہ اس معذوری میں اس طرح بھی قرض لے لینا جائز ہوجائے گا اور مؤاخذۂ آخرت سے بری رہ سکے گا اور بس۔

(۴) اس نمبر کا جواب ابھی ۱ میں بہ تفصیل گذر چکا ہے۔

اب اس کے بعد ضمیمہ کا اصل جواب حاضر ہے، ضمیمہ میں دو قسم کے قرضوں کا ذکر ہے:

پہلی قسم: حکومت کا خود دوسروں سے قرض لینا، اندرون ملک کے باشندوں سے خواہ بیرون ملک کے، پھر خواہ دوسری حکومتوں سے یا وہاں کے سرمایہ داروں سے اور پھر خواہ نفس حکومت کے استحکام وترقی پر خرچ کرنے کے لئے لیا جائے خواہ اپنی رعیت کے فلاح وبہبود پر براہ راست خرچ کرنے کے لئے لیا جائے۔

دوسری قسم: حکومت کا اپنی رعایا کو قرض دینا۔ قسم اول پر کلام کرنے سے زیادہ مقدم واہم قسم ثانی پر کلام کرنا ہے، اس لئے کہ اسی کا تعلق مسلم عوام سے براہ راست ہے اور انہی کے لئے شرعی راہ تلاش کرنا مقصد سوال ہے۔ علاوہ ازیں قسم ثانی پر کلام کر لینے سے قسم اول کے بہت سی صورتوں کا حکم شرعی خود بخود بھی نکل آئے گا۔ قسم ثانی کی موٹی موٹی اور اصولی چھ صورتیں ضمیمہ میں ظاہر کی گئی ہیں، ہر ایک پر بقدر ضرورت کلام کرکے اس کا حکم شرعی منقح کرنا مقصود ہے۔

(۱) **بچوں، بوڑھوں، معذوروں کو وظیفہ دینا:**

یہ صورت اگرچہ اب تک ہمارے ملک میں عام نہیں ہے (۱) لیکن اگر عام ہوجائے

(۱) اب عام ہے، حکومت ان کے لئے وظیفے مقرر کرکے اعانت کرتی ہے، اور مختلف اسکیمیں بناتی ہے۔

تو اس کے جواز میں کوئی خفا یا شبہ نہیں ہوگا، اس لئے کہ یہ خالص وظیفہ یا اعانت یا انعام ہوگا۔ بخلاف اور صورتوں کے کہ ان میں بسا اوقات تفتیش وتحقیق کا اور حکم شرع مستنبط کرنے کا احتیاج ہوگا، پس یہ صورتیں نیز نمبر (۲،۳،۵) کے اندر قرض کی قریب تمام صورتوں کا حکم احقر کے سابق جواب میں آچکا ہے، اور بعض صورتیں جو رہ گئی ہیں ان کا حکم اس وقت ہر نمبر کے تحت بیان کر دیا جائے گا۔

(۲) اس تحریر کا مقصد اگر یہ ہے کہ فنڈ سے لیا ہوا قرض دراصل اسی ملازم کا روپیہ ہے اور اس کی واپسی میں جو رقم زائد سود کے نام پر دی جاتی ہے، وہ بھی دراصل اسی ملازم کو ختم ملازمت پر واپس دے دی جاتی ہے، اس لئے یہ قرض درحقیقت قرض اور یہ سود درحقیقت سود نہ ہوا، کیونکہ قرض تو وہ چیز ہوتی ہے جو دوسروں سے لی جائے اور سود اس زیادتی کا نام ہے جو دوسروں کو دی جائے تو یہ توجیہ وتاویل اور یہ مقصد صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ فنڈ کی اس رقم پر ابھی ملازم کی ملکیت ہی متحقق وثابت نہیں ہوتی ہے۔

اس لئے کہ ملازم کی حیثیت اجیر کی ہوتی ہے، اور فنڈ کی رقم کا وہ حصہ جو تنخواہ سے وضع نہیں ہوتا بلکہ محکمہ اپنی طرف سے ملاتا ہے، اس کا وصول ہونے سے قبل ملک لازم نہ ہونا تو ظاہر ہے، فنڈ کا وہ حصہ جو تنخواہ سے وضع ہوتا ہے وہ بھی جزء اجرت ہوتا ہے اور اجرت پر جب تک اجیر کا قبضہ تصرف نہ ہو جائے اس وقت تک اجیر کی اس پر ملکیت ثابت ومتحقق نہیں ہوتی، صرف استحقاق ملکیت فی الجملہ ہوتا ہے اور یہ ثبوت ملک کے لئے کافی نہیں ہے۔

اسی وجہ سے جب تک فنڈ کی رقم وصول نہیں ہو جاتی اس پر زکوۃ وغیرہ واجب نہیں ہوتی، اور اسی وجہ سے محکمہ جو جزء اضافہ کر کے اور زائد کر کے دیتا ہے اگرچہ سود کے نام پر دیتا ہے اور اپنے فہم وخیال میں اس پر سود کا اطلاق کرتا ہے، اس کو سود نہیں کہا جاتا بلکہ سب کو انعام شمار کیا جاتا ہے اور جائز کہا جاتا ہے۔

غرض وہ رقم دراصل ابھی محکمہ ہی کی ملک ہوتی ہے اور محکمہ کی ملک میں واپس جاتی ہے، اور جب قرض کے نام پر دی جاتی ہے تو قرض ہی شمار ہوگی اور جو نفع اس پر لیا دیا جائے گا، وہ قرض پر ہی نفع لینا دینا شمار ہوگا جس کا سود ہونا ظاہر ہے، اور یہ نسبت کہ یہ فنڈ ملازم کا ہے، یہ نسبت مجازی ہے، مایوؤل کے اعتبار سے ہے۔

اور اگر تسلیم بھی کر لیں کہ وہ زائد رقم (نفع) پھر اسی ملازم کو واپس مل جاتی ہے جب بھی کچھ مفید نہیں، اولاً تو اس لئے کہ وہ رقم بہ شکل نقد ہوتی ہے اور نقود میں قاعدۂ شرعیہ مسلمہ عندالکل ہے کہ تبدل ملک سے تبدل عین ہو جاتا ہے اور تبدل میں واپسی کہاں؟ واپسی تو بعینہ اسی سابق شئ کی واپسی کا ہے اور پھر اگر اس واپسی کو بھی تسلیم کر لیں جب بھی مفید مدعا (عدم ربوا) نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ جب محکمہ اس کو سود قرار دے کر لیتا ہے اور سود ہی کے درجہ میں رکھ کر ملازم کو ختم ملازمت پر دیتا ہے، جیسا کہ سوال سے واضح ہے تو اس واپسی کو استرداد نہیں کہہ سکتے، کیونکہ استرداد میں سابق معاملہ کو فسخ کرنا اور اس کی حیثیت کو مٹانا اور ختم کرنا منوی اور ملحوظ ہوتا ہے اور یہاں ایسا نہیں ہے اور جب یہ واپسی استرداد نہیں ہوئی تو سود کی حقیقت وشناعت بھی ختم نہ ہوئی، بلکہ قائم ومتحقق رہی، لہذا یہ زائد رقم وقرض کا نفع اور سود ہی کے حکم میں ہوگی اور بغیر حاجت واقعی ایسا قرض بھی لینا درست نہ ہوگا، ہاں! اگر بغیر سودی قرض کے چارہ نہ ہو اور محکمہ کے علاوہ کسی دوسرے سے قرض لینے میں سود زیادہ دینی پڑے گی تو اس صورت میں اشد المفسد تین سے بچنے کی نیت سے اس اخف المفسد تین کو ہی گوارہ کیا جائے گا اور اس قرض کو دوسرے قرضوں پر ترجیح ہوگی اور بقدر ضرورت وحاجت کے لینے کی گنجائش ہوگی۔

(۳) **امداد باہمی سوسائیٹوں کے ذریعہ قرض:**

ان سوسائیٹوں کو بھی حکومت ہی قائم کرتی ہے اور کراتی ہے اور اپنی ہی اسکیم کے تحت چلاتی ہے، خواہ شرکت یا مضاربت کے اصول پر، خواہ کسی اور اصول پر، اور اپنی ہی

دی ہوئی یا دلائی رقم واشیاء سے امداد دلاتی ہے، اس لئے ان سوسائیٹوں سے ملی ہوئی امداد (نقد یا بشکل سامان یا دونوں، جو بھی ہو) سب کا حکم اور اس پر وصول کردہ رقم بنام سود کا سود ہونا، یا سود نہ ہونا ان سب کی تفصیل وہی ہوگی جو اصل استفتاء مکتوبہ ۲۴/۱۱/۱۳۸۸ھ کے جواب میں گذر چکی ہے بلکہ اگر ان سوسائیٹوں میں شرکت یا مضاربت کے اصول پر کاروبار کیا جائے تو اس کے نفع کا سود نہ ہونا اور زیادہ آسان اور نمایاں ہو جائے گا، بلکہ اس میں شرکت کرنا اور حصہ لینا بھی درست ہو سکے گا۔

(۴) **بالاقساط ادائیگی ثمن کے وقت پر خرید وفروخت کا طریقہ:**

اس بیع کا حکم عام طور سے فقہاء متأخرین کے فتاوی میں بہ تفصیل موجود ہے، جیسے امداد الفتاوی (ج ۳/۲۰، کتاب البیوع)۔ اور اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر وصول اقساط کے سلسلہ میں کوئی قید عقدِ بیع کے منافی نہ ہو تو بے تکلف یہ بیع جائز رہے گی، اور اگر کوئی قید، عقد بیع کے منافی بھی لگ جائے لیکن ارکان بیع متحقق ہوں تو نفس معاملہ کرنے میں اگرچہ فساد آجائے اور بیع فاسد کہی جائے لیکن یہ بیع بالکل کالعدم اور باطل نہ کہی جائے گی بلکہ مشتری کے حق میں مفید ملک رہے گی، اور اس خرید کردہ شئ سے جو انتفاع ہو جائے گا وہ حرام نہ رہے گا، اور جو تصرف اس میں کیا جائے گا وہ نافذ وصحیح رہے گا، اور ہندوستان جیسے ممالک میں ایسے توسعات کی گنجائش ملتی ہے جیسا کہ ہم اپنے سابق اصل جواب میں مدلل طور پر بیان کر آئے ہیں۔

(۵) **مالیاتی ادارے:**

پہلے عموماً بینکوں میں محض نقد کا لین دین ہوتا تھا اس لئے اس کے منافع کو علی الاطلاق ناجائز اور سود کہا جاتا تھا، لیکن اب بہت سے بینک شرکت ومضاربت کے اصول پر بھی قائم ہوتے اور چلائے جاتے ہیں، اس لئے ان بینکوں میں شرکت کرنا یا ان سے لین دین کرنا جو شرکت یا مضاربت کے اصول کے مطابق ہوں، ناجائز نہ ہوگا۔ اسی طرح ان کے منافع کا ہر حال میں سود ہونا ضروری نہ ہوگا، بلکہ ان بینکوں کے اصول

وضوابط اور ان کے حالات کے اعتبار سے الگ الگ حکم ہوگا، اور جائز بھی ہو سکے گا۔ اسی طرح انشورنس کی حقیقت ابتداء سود اور قمار پر منحصر تھی لیکن اگر اس کے اصول وضوابط میں کچھ تبدیلی ہوتی ہے (جیسا کہ بعض لوگ کہتے ہیں) تو اس کی تفصیل سامنے آنے کے بعد اس کے مطابق بھی حکم شرعی منقح ہو سکے گا۔ بہر حال یہ مالیاتی ادارے بینک کے امداد سے قائم ہوئے ہوں یا انشورنس کی مدد سے یا کسی اور طرح سے قائم ہوئے ہوں، ہمیں اس وقت اس سے بحث نہیں ہے، اس وقت پیش نظر صرف یہ ہے کہ کسانوں کی زمینیں رہن رکھ کر ان کو جو امداد دیجاتی ہے، خواہ نقد سے بصورت قرض یا بصورت سامان یا آلات زراعت یا بیج کھاد وغیرہ کی اشیاء ادھار فروخت کر کے، غرض ان سب صورتوں میں کون کون سی صورتیں اور کون کون سے معاملے شرعی اصول پر جائز ودرست ہیں اور کون کون سے ناجائز اور نادرست ہیں؟ ان سب کی تفصیل بھی اصل سوال کے جوابات میں گذر چکی ہے، وہاں دیکھ لی جائے۔

(۶) **بواسطۂ بینک خرید وفروخت وکاروبار:**

اس طریقہ سے کاروبار کرنے کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں:

(۱) مالک مال از خود بینک کا واسطہ اختیار کرتا ہے، خریدار اس کو پسند نہیں کرتا، مگر وہ بلٹی بینک کے واسطہ سے خریدار کے پاس بھیجتا ہے، اس میں مالک مال کو کئی فائدے ہوتے ہیں: ایک تو یہ کہ بینک سے قیمت فوراً نقد یا کم سے کم مدت میں اور بہت آسانی سے وصول ہو جاتی ہے، دوسرے مال کے ضائع ہونے یا فریب ودھوکہ کھانے یا ادھار معاملہ میں پڑ کر قیمت کے ڈوب جانے وغیرہ کے احتمالات بہت کم ہو جاتے ہیں۔

(۲) کبھی مالک مال از خود نہیں بلکہ قانون وقت کے تقاضے سے مجبور ہو کر بینک کا واسطہ اختیار کرتا ہے اور پھر بقیہ عمل وہی کرتا ہے جو نمبر ایک میں گذری اور خریدار اگرچہ

اس کو پسند نہیں کرتا، مگر انکار بھی نہیں کرتا۔

(۳) کبھی خود حکومت دخیل ہوکر بائع ومشتری کے درمیان میں بینک کو قانوناً واسطہ بنادیتی ہے اور بینک کے ذریعہ سے خرید وفروخت کراتی ہے، یہ دونوں صورتیں پہلی صورت کے اعتبار سے کم ہوتی ہیں۔

(۴) کبھی بینک خود پیش کش کرکے یہ طریقۂ کار، جو نمبر ایک میں گذرا، مالک مال سے اختیار کرالیتا ہے، کیونکہ اس طریقۂ کار سے بینک کو بھی فائدہ پہونچتا ہے، بینک کی آمدنی بڑھتی ہے، یہ صورت پہلی تینوں صورتوں سے کم ہوتی ہے۔

(۵) کبھی یہ طریقۂ کار (بذریعہ بینک کاروبار) خود خریدار بھی اختیار کرتا ہے۔ مگر کم۔ صرف ان صورتوں میں جب خریدار کے پاس اتنا سرمایہ نہیں رہتا کہ ہمیشہ نقد ہی قیمت ادا کرسکے، یا کوئی اور قانونی مجبوری ہوتی ہے، یا راستہ وغیرہ کے خطرہ سے حفاظت مقصود ہوتی ہے۔

(۶) انہی مواقع میں کبھی بینک خود بھی پیش کش کرکے خریدار سے براہ راست یہ طریقۂ کار اختیار کرالیتا ہے۔

یہ اخیر کی دونوں صورتیں بہ نسبت پہلی چار صورتوں کے ابھی بہت کم ہوتی ہیں، اس لئے کہ اس میں خریدار کو اگرچہ کچھ فوائد بھی ہوتے ہیں مگر اس پر کچھ خرچ کا بار زائد ہوجاتا ہے، نیز کچھ ذمہ داریاں وپریشانیاں بھی سوا ہوجاتی ہیں۔

ان چھ صورتوں میں سے پہلی چار صورتوں میں بینک سے خریدار کے قرض لینے یا بینک کو قرض پر نفع دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ ان صورتوں میں خریدار بینک سے قرض کا کوئی معاملہ ہی نہیں کرتا بلکہ مالک خود یا حکومت خود یا دونوں براہ راست بینک سے اپنا معاملہ کرکے اس کو اپنا وکیل یا اجیر بتاتے ہیں، یا بینک خود دخیل ہوکر بجائے خریدار کے مالک مال سے اپنا معاملہ کرلیتا ہے اور ان کی ہدایت کے مطابق خود جو معاملہ چاہتا ہے کرتا ہے، اس میں خریدار بینک سے کہنے نہیں جاتا

کہ مجھے قرض دے دو، یا میری طرف سے اتنا ادا کردو، بلکہ یہ صورت قریب قریب ویسی ہی ہوجاتی ہے جیسی صورت اصل پراویڈینٹ فنڈ میں ہوتی ہے کہ محکمہ خود جو معاملہ چاہتا ہے اپنے ملازم کے ساتھ کرتا ہے، مثلاً یہ کہ ملازم کی تنخواہ سے وضع کردہ روپیہ کے مثل خود اضافہ کرتا ہے یا مثلاً خود ہی نام نہاد جمع شدہ فنڈ پر سود یا سود در سود وغیرہ کے نام سے کچھ رقم اضافہ کرکے دیتا ہے لیکن کوئی اس کو سود نہیں کہتا، پس جس طرح وہاں سود کا تحقق نہیں ہوتا، یہاں بھی نہ ہوگا۔

اور پانچویں وچھٹی صورت میں (یعنی خریدار خود بینک کا واسطہ اختیار کرے یا بینک خود براہ راست خریدار سے معاملہ کرے) بھی مختلف صورتیں ہوتی ہیں: (یہاں الف، ب، ج، د، وغیرہ کے عنوان سے چھ صورتیں لکھی جاتی ہیں)۔

(الف) خریدار کا نقد سرمایہ بینک میں داخل وموجود ہے اور بینک از خود مالک مال کو قیمت جمع کردیتا ہے یا مالک مال کے کہنے سے جمع کرتا ہے، ہر دو صورت میں اس کو خریدار کا قرض لینا نہ کہیں گے بلکہ اسی جمع شدہ سرمایہ سے ادا کرنا یا جمع کرنا محسوب کریں گے اور بینک کو اس کا اجیر یا وکیل کہیں گے، اور جو پیسے بینک خریدار سے وصول کرے گا اس کو اس کے عمل کی اجرت قرار دیں گے۔

(ب) خریدار کا کچھ سرمایہ تو بینک میں جمع نہیں ہے لیکن بینک از خود ادائیگی ثمن کی مقررہ مدت سے قبل ہی مالک مال کو قیمت ادا کردے تو بھی خریدار کا قرض لینا نہ کہیں گے اور پھر بینک خریدار سے جو رقم اصل قیمت مال سے زائد لے گا اس کو سود کہنا ضروری نہ ہوگا، بلکہ محنتانہ واجرت پر محمول کرسکیں گے، اور یہ ظاہر ہے۔

(ج) ادائیگی ثمن کی مقررہ تاریخ ختم ہونے کے بعد بھی اگر از خود قیمت جمع کردے لیکن خریدار سے کوئی معاملہ نہ کرے جب بھی قرض لینا صادق نہ آئے گا اور پھر اس پر بینک جو رقم اصل ثمن سے زائد لے گا اس کو سود کہنا ضروری نہ ہوگا بلکہ محنتانہ یا اجرت لینا کہا جاسکے گا۔

(د) اسی طرح اگر خریدار کا کچھ سرمایہ بینک میں جمع نہ ہو لیکن بینک مال کو اپنے قبضہ ونگرانی میں لے کر قیمت مالک مال کو جمع کر دے، پھر خریدار قیمت ادا کرے اس کے بعد مال پر قبضہ کرنے دے تو اس صورت میں بھی قرض لینے کا معاملہ خریدار سے نہ ہوگا، اور جو پیسے بینک لے گا وہ بجائے سود کے اجرت عمل شمار ہوگی۔

(ہ) ان تمام صورتوں میں (الف سے لے کر د تک) اگر بینک اپنے پاس سے قیمت مال ادا نہ کرے بلکہ خریدار سے جس طرح باقساط یا بہ قسط واحد وصول ہوتی جائے اسی طرح بینک وصول کر کے مالک مال کو دیتا جائے تو اس صورت میں بھی جو پیسہ خریدار سے یا مالک مال سے بینک طے کر کے خود لے گا، وہ سود نہ ہوگا بلکہ وہ اس کی اجرت اور حق المحنت ہوگی اور یہ دینا لینا جائز رہے گا۔

(و) البتہ اگر خریدار بینک سے واقعی قرض لے یا قرض لینے کا معاملہ کرے، مثلاً: اس طرح معاملہ کرے کہ بینک سے کہے کہ تم مالک مال (بائع) کو میری طرف سے قیمت ادا کر دیا کرو میں تم کو بعد میں ادا کر دیا کروں گا تو بیشک یہ دونوں معاملے قرض کے ہوں گے۔ پہلا (یعنی جب قرض لے) خالص قرض کا اور دوسرا (یعنی جب یہ کہے کہ تم مالک مال کو الخ) قرض اور وکالت دونوں کا ہوگا، اور ان دونوں صورتوں میں بینک اپنے دئے ہوئے روپیہ سے زائد رقم خریدار سے وصول کرے گا وہ بلا شبہ سود ہوگی، اور اس صورت میں بے شک سود دینے کا ارتکاب خریدار سے ہوگا جس کی ادائیگی بغیر شدید حاجت کے نہ ہوگی، مثلاً بغیر قرض لئے کام نہ چلتا ہو اور بینک کے علاوہ کہیں اور سے قرض نہ ملتا ہو، یا ملتا ہو لیکن باعتبار بینک کے وہاں سود دینا پڑتا ہو۔

الغرض اس جواب ضمیمہ میں یا اصل سوالنامہ کے جواب میں جن جن صورتوں میں نفع کو سود کہا گیا ہے، وہ شرعی مفہوم ومصداق کے اعتبار سے کہا گیا ہے، اس کی حرمت ہر ملک وزمانہ کے اعتبار سے علی الاطلاق ہے، اخیر ضمیمہ میں ان سرکاری قرضوں کو جن تین صورتوں میں بانٹا گیا ہے، ان میں سے کوئی صورت بھی جب اس پر سود کا شرعی مفہوم صادق

آجائے گا تو اس کو ربائے محرم سے مستثنیٰ نہیں کر سکتے، اسی طرح حضرت مولانا جعفر شاہ صاحب نے اس ربوا کو جس کی حرمت قرآن پاک میں منصوص ہے، یوزری کے ساتھ خاص فرمایا ہے، اگرچہ سوالنامہ ربوا حاصل نہ ہونے کی وجہ سے نیز آکسفورڈ ڈکشنری کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے حضرت موصوف کی مراد متعین نہ ہوئی (۱) لیکن دوسری اس فن کی معتبر کتاب Outline of Economics (آؤٹ لائن آف اکنامکس) مصنفہ منی جوہن سین (Minnie Johnson) ودیا ساگر کالج کلکتہ مطبوعہ ۱۹۲۷ء میں یوزری (Usury) کے یہ تین معنی لکھے ہیں:

(۱) سودخوری

(۲) مروجہ یا قانونی شرح سے زیادہ سود لینا

(۳) بہت بھاری سود لینا (عموماً)

یوزری کے انہی تین معنی میں سے کوئی معنی مراد لینا یا اس کے علاوہ اور کوئی بھی معنی لینا، آیات حرمت ربوا میں ربوا کو اس کے ساتھ مخصوص کر لینا، اس وجہ سے صحیح نہ ہوگا کہ جب شارع علیہ السلام نے خود ربوا کے معنی کی تشریح یا نشاندہی اس انداز سے فرمادی جس میں ہر طرح کا اطلاق وعموم ہے، تو اب کسی دوسرے شخص کو اس کے تقیید یا تخصیص کا حق نہیں پہونچتا، چنانچہ مشہور حدیث جس کو مسلم شریف وابوداؤد ونسائی وترمذی وابن ماجہ سبھی نے نقل کیا ہے، کے الفاظ یہ ہیں:

عن عبادة بن الصامتؓ قال: قال رسول الله ﷺ:
"الذهب بالذهب والفضة بالفضة والبر بالبر والشعير بالشعير والتمر بالتمر والملح بالملح مثلا بمثل سواء بسواء يدا بيد" (أى) (والفضل ربوا) (فتح القدير ج-٥ ص-٢٧٥)

(۱) اصل ڈکشنری سے انگریزی کے الفاظ مع ترجمہ نقل کر دیا گیا ہے، ملاحظہ ہو "صارفین کے لئے قرضوں کی نوعیت" کا آخری حصہ۔

علت حکم جو چیز بھی ہو اتنی بات تو ظاہر ہے کہ ان چھ چیزوں میں سے جب کوئی چیز اپنی جنس کے عوض میں بیچی جائے یا بدلی جائے یا بطور قرض لی یا دی جائے تو کسی قسم کی زیادتی بھی ہو وہ مطلقا ربوائے محرم ہوگی، خواہ وہ مبادلہ (قرض) پیداوار کی صلاحیت بڑھانے کی نیت سے ہو یا کسی انسانی بنیادی ضرورت کی تکمیل کیلئے ہو، خواہ قرضدار کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا مقصود نہ ہو بلکہ نفع پہونچانا مقصد ہو، خواہ وہ بھاری سود یا سودخوری وغیرہ سے بالکل خالی ہو، غرض ہر حال میں وہ زیادتی ربوا ہی شمار ہوگی اور دائرہ حرمت سے باہر نہ ہوگی، ہاں! اگر دربار رسالت علی صاحبہا الصلوۃ والتسلیم کی اتنی صاف وضاحت نہ ہوتی اور پھر کوئی مناسب تاویل قائم ہوجاتی تو کچھ گنجائش بھی ہوتی، خلاصہ یہ کہ جب کسی چیز کا حکم شارع علیہ السلام اطلاق وعموم کے ساتھ صاف واضح لفظوں میں بیان فرمادیں تو کسی بشر کو یہ حق نہیں رہتا کہ وہ اس میں بغیر کسی نص کی مدد کے کوئی تقیید یا تخصیص یا کسی قسم کا تغیر وتعین کرسکے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اشکال یہ ہے کہ جب شارع علیہ السلام نے ربوا کا مفہوم اس طرح اطلاق اور عموم کے ساتھ صاف اور واضح بیان فرمادیا ہے تو پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمانے کا کیا مقصد ہے:

إن آخر ما نزلت آية الربوا و"إن رسول الله ﷺ قبض ولم يفسرها لنا فدعوا الربوا والريبة" (ابن ماجه، كتاب التجارات، باب التغليظ (١٢) فى الربا (١٨٦٠): حاشية السندى على ابن ماجة: (٢٢٧٦)، والدارمى ١/٦٤ فى المقدمة، باب كراهة الفتيا (١٨) رقم: (١٢٩)۔ مشکوٰۃ، ج ۱/۲۸۳)

جواب یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آیت ربوا مجمل ہے یا اس کے مفہوم ومصداق میں گنجلک ہے جس کی وجہ سے تقاضائے آیت پر

عمل کرنے میں دشواری ہے، یہ مفہوم تو ایک معمولی انسان بھی نہیں لے سکتا چہ جائے کہ حضرت عمر فاروقؓ جیسا جلیل القدر اور قوی الایمان صحابی، اس لئے کہ اس میں کھلا اعتراض اسلام وتعلیمات اسلام پر ہوتا ہے، نعوذ باللہ من ذلک اور اس کی زد ذات باری عزاسمہ تک پہونچتی، وتعالیٰ الله عن ذلك علوا كبيرا۔

بلکہ اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ آیت ربوا آیت محکمہ ہے، اس میں نسخ وتغیر وغیرہ کسی چیز کا احتمال نہیں ہے اور نہایت واضح اور مفسر ہے، اسی لئے حضور ﷺ نے اس کی تفسیر نہیں فرمائی، اور اتنی اہم ہے اور خوفناک ہے کہ جو چیزیں صریح ربوا ہیں ان کو تو چھوڑنا ہی ہے، جن چیزوں میں شبۂ ربوا ہو تو بھی چھوڑ دینا چاہئے، چنانچہ علامہ طیبیؒ اسی مفہوم کو ان لفظوں میں ادا فرماتے ہیں:

"إن هذه الآية ثابتة غير منسوخة غير مشتبهة فلذلك لم يفسرها النبى ﷺ فأجروها على ما هى عليه، فلا ترتابوا فيها، واتركوا الحيلة فى حلها" (شرح الطيبى ٦/٥٨، ح: ٢٨٣)۔

اور خود حضرت فاروقؓ کے اس جملہ "فدعوا الربوا والريبة" سے بھی اسی مفہوم کا پتہ لگتا ہے۔

اسی طرح "الأمور بمقاصدها" میں امور سے وہ امور مراد ہیں جن کا حسن وقبح یا جن کا حکم یا حرمت منصوص نہ ہو تو ان کا حسن وقبح یا حکم ان کے مقاصد سے نکل سکتا ہے، نہ یہ کہ سارے ہی امور واحکام کا مدار ان ہی مقاصد پر ہو، اسی طرح "الضرورات تبيح المحظورات" میں بھی الف ولام عہد کا ہے، اور وہ ضرورتیں مراد ہیں جو ملجی اور منجر ہوجاتی ہیں اضطرار ومخمصہ تک، نہ کہ تمام ہی ضرورتوں کا یہی حکم ہو، ایسا ہرگز نہیں ہے، چنانچہ اس سے اگلا جملہ "ومن ثم جاز أكل الميتة عند المخمصة" جو بالکل اس قاعدہ سے متصل اور اسی کی تمثیل ہے، اس کی وضاحت کررہا ہے، جیسا کہ سابق جواب میں بھی ہم اس کی وضاحت کرآئے ہیں۔

الغرض جس معاملہ پر سود کا مفہوم شرعی صادق آجائے جس طرح اس کو غیر سود یا مباح وجائز کہنا درست وجائز نہیں ہوگا، اسی طرح جس معاملہ پر سود کا مفہوم شرعی صادق نہ آوے اس کو سود یا حرام کہنا درست ومباح نہ ہوگا بلکہ ان فروق کا واضح کرنا ہمیشہ اور ہر زمانہ کے علماء ومشائخ پر ضروری رہے گا، تاکہ دین متین کی جامعیت وجاذبیت وہمہ گیری وہردلعزیزی، نیز ''الحلال بین والحرام بین'' اور'' الدین یسر'' (بخاری: کتاب الإیمان (۳۹)، کتاب الرقاق (۶۴۶۳) ہمیشہ ہمیشہ نمایاں وغالب رہے۔

اس تمام تر گفتگو سے قرض کی قسم اول (حکومتوں کا خود قرض لینا) کا حکم بھی خود بخود نکل آیا، اور اسی تفصیل پر جواوپر گذری اس کو منطبق کر لینا کافی ہوسکتا ہے، اس لئے فقط ایک بات اس کے متعلق عرض کر کے جواب کو ختم کرتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ اگر حکومت کو اندرون ملک کے باشندوں سے قرض لینا ہو تو سود پر نہ لینا چاہئے بلکہ جہاں تک ہوسکے باشندگان ملک کے سامنے ملکی ضروریات رکھ کر ہمدردی کی ترغیب وتحریض دلا کر بطور قرض حسنہ (غیر سودی قرض) لینا چاہئے، افراد ملک پر بھی اخلاقاً ضروری ہے خاص کر صاحب سرمایہ وصاحب حیثیت اصحاب پر کہ وہ ملک کی مضبوطی وترقی کے لئے حکومت کو قرض حسنہ (قرضہ غیر سودی) دیں کہ ملک کی اور اہل ملک کی ہمدردی وبہی خواہی کا تقاضا بھی یہی ہے۔ (۱)

فقط واللہ اعلم
کتبہ الاحقر
نظام الدین
۲۷/۷/۱۳۹۱ھ

☆☆☆☆

(۱) مشورہ تو بہت بہتر ہے، لیکن آج کل حکومتیں جمہوری ہونے کے باوجود آمرانہ ہوگئی ہیں، وہ اپنے ذاتی مفاد کے لئے لمبے لمبے سودی قرض لیتی ہیں، اور باشندگان ملک کو ٹھڈیوں تک قرض میں غرق کر دیتی ہیں، اور ان کو اس کی ذرہ پرواہ نہیں ہوتی، ان کے طرز حکمرانی سے ملک اور اہل ملک کے ساتھ ہمدردی وخیر خواہی کم جھلکتی ہے۔ (مرتب)

جواب مولانا سید محمد میاں دیوبندی ثم دہلوی صاحبؒ ☆

جواب متعلق حصول قرض از حکومت
منجانب دارالافتاء مدرسہ امینیہ اسلامیہ دہلی

(الف) مولانا محمد الیاس صاحب برنی مرحوم کی تعریف کی بنیاد پر بھی اس سود کو ٹیکس نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ ٹیکس جس دولت کا دیا جاتا ہے وہ ٹیکس ادا کرنے والے کی ملکیت

☆ مولانا سید محمد میاں دیوبندی (پ: ۴/اکتوبر ۱۹۰۳ء- ت: ۲۴/اکتوبر ۱۹۷۵ء) ہندوستان کے مشہور مؤرخ، سیاست داں، دانشور اور ماہر تعلیم تھے، تحریک آزادی ہند میں بھرپور حصہ لیا، جمعیۃ العلماء ہند کے ناظم وترجمان، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی کے افکار کے حامل اور مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے معتمد علیہ، معاون ومددگار بھی تھے، مدرسہ امینیہ دہلی کے شیخ الحدیث اور صدر مفتی رہے، اصل نام مظفر میاں تھا، دیوبند کے قدیم خاندان سادات رضویہ سے تعلق تھا، جو دیوبند کے سادات خاندان میں سب سے بڑا سمجھتا جاتا تھا، مؤرخ ملت، سید الملت لقب ہے، ولادت دیوبند کے محلّہ پیرزادگان میں ۴/اکتوبر ۱۹۰۳ء میں اور وفات دہلی میں ہوئی، عمر ۷۲/سال تھی، اردو اور فارسی کی بعض کتابیں ٹنڈھیرہ، ضلع مظفرنگر اور قصبہ ببونہ میں پڑھیں۔

۱۹۱۶ء میں دارالعلوم دیوبند کے درجہ فارسی میں داخل ہوئے، ۱۹۲۵ء میں سند فراغت حاصل کی، آپ کا شمار حضرت علامہ انور شاہ کشمیری، شیخ الفقہ والادب مولانا اعزاز علی امروہوی، علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، اور علامہ شبیر احمد عثمانی کے ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے، ۱۹۲۶ء میں مولانا اعزاز علی کے ایماء پر مدرسہ حنفیہ آرہ (شاہ آباد، بہار) میں تدریس کا آغاز کیا اور تین سال کے بعد واپس آگئے، پھر مارچ ۱۹۲۸ میں جامعہ قاسمیہ شاہی مدرسہ مرادآباد میں تدریس سے منسلک ہوگئے، یہاں سے آپ مدرس، مفتی، منتظم، مہتمم اور رکن شوری ورکن عاملہ کی حیثیت سے تاحیات وابستہ رہے، حتی کہ دہلی میں جمعیت علماء کے ناظم اور مدرسہ امینیہ میں شیخ الحدیث کے عہدے پر فائز رہنے کے دوران بھی مدرسہ شاہی میں بہ حیثیت مدرس ومفتی ومنتظم ۱۶/سال باقاعدہ قیام فرمایا، ۱۹۴۵ء میں جمعیت علماء ہند کے ناظم عمومی مقرر ہوئے اور جمعیت کی خدمت کے لئے دہلی آئے اور ۱۹۴۷ء کے ہنگامۂ آزادی وتقسیم ملک کے بعد مستقلاً دہلی میں قیام فرمایا، (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہوتی ہے، یہاں مسئلہ قرض کا ہے، قرض کی رقم کو مملوکہ دولت یا اپنی آمدنی نہیں کہا جاسکتا اور معاشیات کے جدید ماہرین تو قرض کو اجارہ کی صورت قرار دیتے ہیں اور اسی بناء پر وہ سود کو کرایہ کی حیثیت دے کر جواز کا راستہ نکالنا چاہتے ہیں، فقہاء کرام کی تحقیق وتنقید کے بموجب بھی قرض کی نوعیت استعارہ جیسی ہوتی ہے اگرچہ مستقرض کو قرض کا مالک تسلیم کرلیا جاتا ہے تاکہ اس کے مثل کا واپس کرنا لازم کیا جاسکے، مگر بنیادی طور پر عاریت ہے "فجعل التقدیر کأن المستقرض انتفع بالعین مدة ثم رد عین ما قبض، وإن کان یرد بدله فی الحقیقة وجعل رد بدل العین بمنزلة رد العین"۔ (بدائع الصنائع ج۔ ۷ ص۔۳۹۶)

اسی بناء پر اس رقم پر زکوۃ واجب نہیں ہوتی، کیونکہ وجوب زکوۃ کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرض سے فاضل اور فارغ ہو۔

(ب) جبکہ معاملہ قرض واستقراض کا ہے، رقم دینے والا ادارہ اس کو قرض قرار دے رہا ہے تو ایسی توجیہ فتوی کی بنیاد نہیں بن سکتی جو مالک (قرض دینے والے) کی منشأ کے

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) دہلی کے بعد مدرسہ شاہی کے رکن شوریٰ منتخب ہوئے۔

بچپن میں قرآن پاک حفظ نہیں کرسکے تھے، یہ سعادت جدوجہد آزادی کے زمانے میں قید وبند کی صعوبتوں کے دوران حاصل کی، اصلاحی تعلق حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی سے قائم فرمایا اور اجازت وخلافت سے سرفراز ہوئے، جمعیت علماء کے رکن عاملہ، اور جمعیت ٹرسٹ کے ناظم اور ادارۂ مباحث فقہیہ کے مدیر کے عہدوں پر تاحیات فائز رہے، ۱۹۶۲ء میں دہلی کے مشہور عالم درس گاہ اور علامہ مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ دہلوی کی یادگار مدرسہ امینیہ میں شیخ الحدیث اور صدر مفتی کے عہدے پر فائز ہوئے اور تاحیات یہ خدمت انجام دیتے رہے۔

آپ کے مؤلفات کی تعداد نوّے ہے، جن میں ''علمائے ہند کا شاندار ماضی'' (۴ جلدیں)، علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے، جمعیت علمائے ہند کیا ہے؟، عہد زریں (۲ جلدیں)، سیرت محمد رسول اللہ ﷺ'' قابل ذکر ہیں۔

۶ رشوال ۱۳۹۵ھ مطابق ۲۴ راکتوبر ۱۹۷۵ء بہ روز چہار شنبہ شام ساڑھے چار بجے جان، جان آفریں کے سپرد کردی، غفرلہ اللہ وأدخلہ فسیح جناتہ، جمعیت علماء ہند کے مرکزی دفتر واقع مسجد عبدالنبی کے قریب گورغریباں میں تدفین عمل میں آئی۔ (مزید معلومات کے لئے دیکھیں: پس از مرگ زندہ، ص ۳۷-تا ص ۱۰۷)۔

خلاف ہو اور خود معاملے کی نوعیت اس کی تردید کررہی ہے۔

(ج) بے شک اس رقم کا کوئی ایک فرد مالک نہیں ہے، موجودہ اطلاعات کے بموجب پوری قوم اس کی مالک ہے، گویا بیت المال کی رقم ہے یا وقف ہے، لیکن "کل قرض جر منفعة فهو ربوا" کے ضابطہ سے بیت المال کی رقم یا موقوفہ رقم کو بھی خارج نہیں قرار دیا جاتا، اور نہ ارشاد ربانی "احل الله البیع وحرم الربوا" میں کوئی استثناء ہے بلکہ احادیث مبارکہ نے شبۂ ربوا کو بھی حرام قرار دینے کی ہدایت فرمائی ہے: "الحلال بین والحرام بین وبینهما متشابهات الی آخر ما قال رسول الله ﷺ"۔ (متفق علیہ، بخاری: کتاب البیوع (۲۰۵۱)، مسلم: کتاب الطلاق (۱۵۹۹)۔

(۲) جائز نہیں کہا جاسکتا، کیونکہ اول تو جلب منفعت جواز کی وجہ نہیں ہوتی، اس کے علاوہ یہ مصالح ایسے بھی نہیں ہیں جن کی بناء پر ایسا اضطرار ثابت ہوجائے جو فقہ میں معتبر ہے۔

(۳) (الف) یقیناً فرق ہوگا، لیکن جہاں تک محرمات کا تعلق ہے ان کا ارتکاب دار الحرب میں بھی جائز نہیں ہے، بے شک امام صاحبؒ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کسی مسلمان نے دارالحرب میں سود لے لیا تو دارالاسلام میں اس کے واپس کرنے کا فیصلہ نہیں کیا جائے گا لیکن کھلے بندوں سودی کاروبار یا دارالحرب میں سود ادا کرنے کا جواز امام صاحبؒ سے بھی ثابت نہیں ہے۔

(ب) البتہ اس بنیاد پر کہ حکومت محض اپنے اقتدار کی بناء پر ہماری طرف سے وکیل بن کر اتنی بڑی رقم دوسرے ممالک سے قرض لے چکی ہے کہ کئی ارب سالانہ اس کا سود ہمیں ادا کرنا پڑ رہا ہے یعنی ہم بالجبر سودی نظام میں مبتلا کردئے گئے ہیں جس کا نقصان ٹیکسوں کی ادائیگی کی صورت میں ہمیں اٹھانا پڑ رہا ہے تو اگر اس نقصان کی تلافی کے لئے کوئی صورت نکالی جائے جس کے لئے حکومت سے سودی قرض لینا

پڑے تو جواز کی گنجائش نکل سکتی ہے: "لأن الضرر يزال" اگر چہ احتیاط یہی ہے کہ احتیاط برتی جائے، **قال حسان بن أبی سنان:** "ما رأيت شيئاً أهون من الورع، دع ما يريبك إلى ما لا يريبك" (بخاری شریف: ج ۲/ ح: ۷۲۴، کتاب البیوع، باب تفسیر المشتبہات، ص ۲۷۵)۔

☆☆☆☆

جواب مولانا عبدالصمد رحمانیؒ☆

حامداً ومصلیاً ومسلماً

اس سوالنامہ میں تمہید کے بعد حکومت سے سودی قرض کے حصول کے جواز وعدم جواز کے متعلق دو نمبروں میں دو صورتوں کے ذریعہ شرعی جواب طلب کیا گیا ہے اور تیسرے نمبر میں حقیقۃً دارالاسلام اور دارالحرب کی بابت سوال ہے کہ ان دونوں مقام میں کوئی فرق

☆ مولانا عبدالصمد رحمانی (پ: ۱۳۰۰ھ- ت: ۴/مئی ۱۹۷۳ء) مشہور محقق اور فقیہ تھے، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ کے زیر نگرانی تربیت پائی اور حضرت مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد کی رفاقت میں دعوت وتحریک کا تجربہ حاصل کیا۔

بہار میں جب فتنۂ قادیانیت کا ہنگامہ بپا ہوا اور عیسائیوں اور آریہ سماجیوں نے اپنی تحریک تیز کردی تو آپ نے مولانا محمد علی مونگیری کی زیر نگرانی، ان تینوں تحریکوں کے خلاف تحریری وتقریری جہاد میں حصہ لیا، ۱۹۷۲ء میں مولانا مونگیری کے وصال کے بعد مولانا ابوالمحاسن سید محمد سجاد کی دعوت پر آپ خانقاہ رحمانی سے پٹنہ منتقل ہوگئے، اور امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے دفتری امور کے نگران اعلی مقرر ہوئے، امارت شرعیہ کی تحریک کو زیادہ منظم اور فعال بنانے کے لئے آپ نے اکثر علاقوں کا دورہ کیا، اسے مؤثر بنانے کے لیے کتابیں، مقالات اور مضامین لکھے۔

جب جمعیت علماء ہند نے سول نافرمانی کی تجویز پیش کی اور اکابر علماء گرفتار کئے گئے تو ۱۹۳۰ء میں جمعیت علماء کے ناظم اور مرکزی دفتر کے ذمہ دار اعلی مقرر کئے گئے، ۱۹۳۷ء میں صوبہ بہار کی حکمراں جماعت ''مسلم انڈپیڈنٹ پارٹی کے دفتر کے ناظم اعلی مقرر ہوئے، اور ۲۳/مارچ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۷۳ء تک امارت شرعیہ بہار واڑیسہ کے نائب امیر شریعت دوم رہے، سیاسی زندگی کی ہماہمی کے باوجود آپ نے ہمیشہ علمی مشغلہ جاری رکھا، ایک عرصہ تک خانقاہ رحمانی مونگیر سے شائع ہونے والے علمی ماہنامہ ''الجامعہ'' کے مدیر رہے، تصانیف کی تعداد ساٹھ سے اوپر ہے، جن میں اہم ترین یہ ہیں: ''ہندوستان اور مسئلہ امارت، کتاب العشر والزکوۃ، تاریخ امارت (اس کی ترتیب میں مفتی ظفیر الدین مفتاحی بھی شریک رہے)، آداب قضاء، حیات سجاد، تیسیر القرآن، غیر مسلموں کی جان ومال کے متعلق اسلامی نقطۂ نظر، پیغمبر عالم وغیرہ، (ماہنامہ رفیق پٹنہ ''علمائے بہار نمبر'' شمارہ ۱-۲، جنوری-فروری ۱۹۸۴)۔

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہوگا یا نہیں؟ جس کا مقصد بظاہر یہ سوال معلوم ہوتا ہے کہ سودی قرض کے لین دین کے معاملہ میں دارالاسلام اور دارالحرب میں کوئی فرق ہوگا یا نہیں؟

ان کا اجمالی جواب تو یہ ہے کہ پہلے نمبر کی بنیاد پر حکومت سے سودی قرض لینا آئین اسلامی کی رو سے مباح نہ ہوگا، دوسرے نمبر کی بنیاد پر حکومت سے سودی قرض لینا آئین اسلامی کی رو سے جائز ہوگا، تیسرے نمبر کا جواب یہ ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب میں بہت سے مسائل میں فرق ہے، ہر نمبر کی تفصیل ذیل میں ملاحظہ ہو۔

سوال نمبر ایک کا جواب:

جب اس سود پر (جو حکومت اپنے کسی شہری کو قرض دے کر حاصل کرتی ہے) ٹیکس

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) مولانا بالغ نظر عالم دین اور فقہی بصیرت رکھنے والے مصنف تھے، مطالعہ میں بڑی وسعت و گہرائی تھی، مولانا منت اللہ رحمانی کے استاد تھے، ان کو عربی صرف ونحو کی تعلیم دی ہے، آپ کی نائب امیر شریعت ثانی کی مدت تقریباً ۳۳ رسال ہے یعنی ۲۳ رمارچ ۱۹۴۵ء تا ۴ رمئی ۱۹۷۸ء، زندگی کے آخری لمحات تک، وفات خانقاہ رحمانی مونگیر میں ہوئی اور خانقاہ ہی کے مقبرہ میں مدفون ہوئے۔

آپ ایک متبحر عالم دین، بے مثال فقیہ، بلند پایہ محقق، کثیر التصانیف اور روحانی کمالات کے حامل تھے، وہ اپنے علم وفضل، زہد وتقوی، سادگی، وبے نفسی اور عاجزی وخاکساری میں علماء سلف کی زندہ یادگار تھے، مدرس ومعلم بھی رہے اور امارت شرعیہ کے ناظم ومفتی بھی، اور از ہر ہند دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوری کے معزز رکن بھی، پوری زندگی علمی ودینی اور قومی وملی خدمات میں گزار دی۔

صوبہ بہار کے ایک قصبہ ''باڑھ'' کے ایک گاؤں ''بازید پور'' میں ۱۳۰۰ھ فصلی میں ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوئے، مانڈر ضلع مونگیر میں شادی ہوئی اور بعد میں وہیں سکونت اختیار کر لی، ابتدائی تعلیم گھر میں ہوئی، عربی کی ابتدائی کتابیں مولانا حکیم محمد صدیق صاحب سے پڑھیں، ہدایۃ النحو تک ان سے تعلیم حاصل کی پھر ۱۳۲۷ھ میں جامع العلوم کانپور کا سفر کیا، کچھ دنوں وہاں رہ کر الہ آباد کا سفر کیا، جہاں مدرسہ سبحانیہ میں حضرت مولانا محمد سجاد صاحب جیسے لائق اور باکمال استاد کے حلقہ درس میں شامل ہو کر ان کی صحبت وتربیت سے پوری طرح مستفیض ہونے کا موقع ملا، اس کے بعد معقولات کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے غور غشتی پشاور گئے، علمی تحقیقات وتصنیفات کی فہرست خاصی طویل ہے، چند مؤلفات کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: فتاوی امارت شرعیہ اول از ص: ۴۲ تا ۴۵)۔

(محصول) کی تعریف صادق آتی ہے، اس کی ملک بھی عام ہوتی ہے اور اس کا مصرف بھی عام ہوتا ہے، تو کیا محض اس وجہ سے کہ حکومت اس کا نام سود رکھتی ہے، اسے ربوا شرعی قرار دے کر حرام اور اس کی وجہ سے قرض مذکور لینے کو حرام سمجھا جائے گا یا اسے بھی ٹیکس ہی کی ایک شکل سمجھ کر اس کی ادائیگی کو جائز اور ایسے قرض لینے کو مباح قرار دیا جا سکتا ہے؟

ٹیکس کی معاشی اصطلاح جو استفتاء کی تمہید میں مندرج ہے، نہ معلوم موجودہ دور کے سیاسی ٹیکس کی اصطلاح سے موافق ہے یا مختلف ہے، اگر مختلف ہے تو پھر ٹیکس کی اس تعریف کو بنیاد بنا کر فقہی رائے کا اظہار غلط ہوگا، کیونکہ حکومت سے قرض کا معاملہ حکومت کی سیاسی اصطلاح پر ہوگا، نہ کہ معاشیات کی علمی اصطلاح پر۔

اور اگر ٹیکس کی تعریف مذکور موافق ہے تو اب اس کے متعلق قابل غور امر یہ ہے کہ وہ رقم جو مقروض حکومت کو قرض سے فاضل دے گا، سیاسی اور معاشی اعتبار سے تو وہ ٹیکس ہوگا اور چونکہ مصارف حکومت کے لئے حکومت کو مختلف قسم کا ٹیکس دینا جائز ہے لہذا حکومت کو یہ فاضل رقم بھی مقروض کا دینا شرعا جائز ہوگا، مگر اس شرعی اصطلاح اور اصول کے اعتبار سے کہ "کل قرض جرّ نفعا فهو ربوا" یہ فاضل رقم سود ہوگی، اور سود کا لینا اور دینا چونکہ شرعا حرام ہے، لہذا حکومت کو یہ فاضل رقم مقروض کا دینا شرعا حرام ہوگا۔

اب اس فاضل رقم میں یہ دو اعتبار اور دو جہتیں اس مخمصہ کو مستلزم ہیں کہ اس فاضل رقم کا دینا ایک دلیل (یعنی ٹیکس) کی بناء پر تو جائز اور حلال ہوگا اور دوسری دلیل یعنی (حدیث) کی بناء پر ناجائز اور حرام ہوگا اور اس طرح سے تعارض کی صورت میں آئین اسلامی یہ ہے۔ "إذا تعارض دليلان أحدهما يقتضى التحريم والآخر الإباحة قدم التحريم" (اشباہ: ص ۷۶)۔ لہذا باوجود اس کے کہ اس فاضل رقم پر ٹیکس کی تعریف صادق آتی ہے اور ٹیکس کا دینا جائز ومباح ہے، اس آئین اسلامی پر کہ ''قدم التحریم'' یہاں اس فاضل رقم پر شرعی حکم ربوا ہی کو تقدم حاصل ہوگا، اور اس کا دینا حرام ہوگا اور اس کی وجہ سے قرض مذکور لینا بھی حرام ہوگا۔

علاوہ بریں آئین اسلامی کا ایک اصول "درء المفاسد أولى من جلب المصالح" **بھی ہے، اشباہ میں ہے:** "درء المفاسد أولى من جلب المصالح فإذا تعارضت مفسدة ومصلحة قدم دفع المفسدة غالبا، لأن اعتناء الشرع بالمنهيات أشد من اعتنائه بالمأمورات، ولذا قال ﷺ: إذا أمرتكم بشيئ فأتوا منه ما استطعتم، وإذا نهيتكم عن شيئ فاجتنبوه" روى فى "الكشف" حديثا لترك ذرة مما نهى الله عنه أفضل من عبادة الثقلين، ومن ثم جاز ترك الواجب دفعا للمشقة، ولم يسامح فى الإقدام على المنهيات خصوصا الكبائر، ومن ذلك ما ذكره البزازى فى فتاواه: ومن لم يجد سترة ترك الاستنجاء ولو على شط نهر، لأن النهى راجح على الأمر حتى استوعب النهى الأزمان، ولم يقتض الأمر التكرار" انتهى۔ (اشباہ: ۲۶۵)

اوراس فاضل رقم کی ادائیگی میں چونکہ جلب منفعت کی مصلحت کے ساتھ شرعی مفسدہ بھی ہے تو ایسی صورت میں شرعا آئین میں مذکور کی بناء پر اس کا حرام قرار دینا ہی اولی ہے۔

سوال نمبر دوم کا جواب:

اگر مندرجہ بالا رقم "سود" ٹیکس میں داخل نہیں ہے بلکہ ربوا شرعی ہے، تو کیا مصالح مذکورہ (جو تمہید میں مذکور ہے) کی بناء پر حکومت سے ایسے قرض لینے کو جائز کہا جاسکتا ہے جس کے لئے مندرجہ بالا سود کی ادائیگی لازم ہے؟

انسان کی دینی، معاشی، سماجی، تعمیری زندگی میں قدرتی طریق پر کچھ تو ایسی چیزیں ہیں جن کو فقہاء اپنی اصطلاح میں "ضروریہ" کہتے ہیں اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کو فقہاء اپنی اصطلاح میں "حاجیہ" کہتے ہیں اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کو فقہاء اپنی اصطلاح میں "تحسینیہ" کہتے ہیں۔

انسانی زندگی میں وہ "ضروریہ" کن چیزوں کو کہتے ہیں؟ ان کے الفاظ میں ان کی تصریح یہ ہے: (فأما الضرورية: فمعناها أنها لا بد منها فى قيام مصالح الدين

والدنيا، بحيث إذا فقدت لم نجد مصالح الدنيا على استقامة، بل على فساد وتحارج وفوت حياة وفى الأخرى فوت النجاة والنعيم والرجوع بالخسران المبين۔ (الموافقات للشاطبى ج۲/ ص۸، كذا فى حاشية الأشباه: ص ۲۵۲، ح۳، قاعده خامسه)۔

مطلب یہ ہے "ضروریہ" فقہاء کے نزدیک انسانی زندگی کی وہ چیزیں ہیں جو دنیا اور دین کے مصالح کے قیام وبقا کے لئے ناگزیر ہوں، یعنی انسانی زندگی کی تعمیر میں ان کی ایسی اہم حیثیت ہو کہ ان کے فقدان پر یعنی عدم پر دنیاوی مصالح صحیح نہج پر جاری اور باقی نہ رہ سکیں، بلکہ انسانی زندگی فساد، تحارج (تنگی) اور ہلاکت سے دوچار ہوجائے اور اخروی زندگی میں آخرت کی نعمت اور نجات سے محروم ہوجائے، اور خسران مبین کا مستحق ہوجائے۔

انسانی زندگی میں وہ (حاجیہ) کن چیزوں کو کہتے ہیں؟ ان کے الفاظ میں اس کی توضیح یہ ہے: (فأما الحاجيات: معناها أنها مفتقر إليها من حيث التوسعة ورفع الضيق المؤدى فى الغالب الى الحرج والمشقة ...... ولكنه لا يبلغ مبلغ الفساد العادى المتوقع فى المصالح العامة) (ایضا: ص۱۱) حاجیہ کا مطلب یہ ہے کہ ایسی چیزیں ہیں جو انسانی زندگی کی تعمیر میں (قیام وبقا کے لحاظ سے نہیں بلکہ) وسعت وفراخدلی کے حصول کے لئے ان کی ضرورت ہو، نیز ایسی تنگی اور حرج کے دفعیہ کے لئے جس سے اکثر وبیشتر اصل مطلوب ومقصود ہی فوت ہوجائے ان کی حاجت ہو، یعنی وہ ایسی اہمیت اپنے اندر رکھتی ہوں کہ ان کی رعایت نہ کرنے سے فی الجملہ انسان حرج ومشقت میں مبتلا ہو جائے ......لیکن یہ حرج ومشقت اس درجہ کے فساد کو مستلزم نہ ہو جو فساد عادۃ مصالح عامہ کے فساد میں متوقع ہوتی ہے۔

"تحسینیہ" ان کے نزدیک ذیل کی نوعیت کی چیزیں ہیں۔

"وأما التحسينيات: فمعناها الأخذ بما يليق من محاسن العادات وتجنب الأحوال الدنيات التى تأنفها العقول الراجحات"۔ (ج۲ ص ۱۱)

تحسنیات کا مطلب اچھی عادتوں کا اختیار کرنا ہے اور ان گندی حالتوں سے پرہیز کرنا ہے جن کو عقول سلیمہ مکروہ وناپسندیدہ سمجھتی ہیں، یعنی زندگی کی وہ چیزیں جن کی رعایت کی بناء پر معاشرہ میں انسان مہذب اور بلند اخلاق سمجھا جاتا ہے اور جن کے عدم لحاظ پر معاشرہ میں انسان غیر مہذب، غیر متمدن اور گرا ہوا سمجھا جاتا ہے۔

ان تفصیلات کے آجانے کے بعد یہ بات پیش نظر رکھنے کی ہے کہ فقہی احکام میں شریعت نے عدم حرج، اور قلت تکلف کو بنیادی اصول قرار دیا ہے یعنی شریعت کا بنیادی اصول تنگی اور تکلیف کو دور کرتا ہے، چنانچہ اس کے بارے میں قرآن مجید میں یہ تصریح ہے:

(۱) ما جعل علیکم فی الدین من حرج، یرید الله أن یخفف عنکم وخلق الإنسان ضعیفا۔(نساء: ۲۸)

(۲) ما یرید الله لیجعل علیکم من حرج۔ (مائدہ:٦)

(۳) یرید الله بکم الیسر ولا یرید بکم العسر۔ (بقرہ: ۱۸۵)

(٤) لا یکلف الله نفسا الا وسعها۔ (بقرہ: ۲۸۵)

ان نصوص قطعیہ کی بناء پر انسانی زندگی کے ان امور میں جن کو فقہاء ضروریہ اور حاجیہ کہتے ہیں، ان کے قیام، بقاء، حصول اور بروئے کار لانے میں اگر کوئی شرعی حکم حرج (تنگی) یا تکلیف کو مستلزم ہو تو شرعاً وہ حرج اور تکلیف دور کی جائے گی، اور الأهم فالأهم کو مدنظر رکھ کر تنگی اور حرج کو دور کرنے کے لئے محظور شرعی کو بھی مباح قرار دینا درست ہوگا، اور اس پر ہر دور کے فقہاء کا عمل رہا ہے، اشباہ میں ہے:

"الضرورات تبیح المحظورات، من ثم جاز أکل المیتة عند المخمصة وإساغة اللقمة بالخمر والتلفظ بکلمة الکفر للإکراه، وکذا إتلاف المال وأخذ المال من الممتنع من أداء الدین بغیر إذنه، ودفع الصائل ولو أدی إلی قتله" (ص۵۸)

پھر آگے چل کر لکھا ہے:

"الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة کانت أو خاصة ولهذا جوزت الإجارة علی خلاف القیاس للحاجة" ۔ (ص: ۲٦۷)۔

اس طرح اور بھی فقہی احکام بیان کئے گئے ہیں مثلاً:

"ومن ذلك جواز السلم علی خلاف القیاس لکونه بیع المعدوم دفعا لحاجة المفالیس، ومنها: جواز الاستصناع للحاجة، ومنها: دخول الحمام مع جهالة مکثه فیها وما یستعمله من مائها وشربة السقاء، ومنها: الإفتاء بصحة بیع الوفاء حین کثر الدین علی أهل بخاری وهکذا بمصر وقد سموه بیع الأمانة" (ص٦۳)

ان تصریحات فقہیہ کے بعد ان امور کے متعلق جو قرض لینے کی حاجت کے عنوان کے تحت استفتاء میں مذکور ہیں بلا پس وپیش یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ سب انسانی زندگی کے امور حاجیہ میں سے ہیں، لہذا ان کی تنگی اور تکلیف کو دور کرنے کے لئے سودی قرض حکومت سے لینا ''آئین اسلامی'' کی رو سے جائز ہوگا، چنانچہ اشباہ میں اس کی تصریح ہے:

"وفی القنیة والبغیة یجوز للمحتاج الاستقراض بالربح انتهی" (٦۳)

علاوہ بریں فقہاء کے یہاں ایک قاعدہ ''المشقة تجلب التیسیر'' بھی ہے۔ اشباہ میں ہے:

"القاعدة الرابعة: المشقة تجلب التیسیر، والأصل فیها قوله تعالیٰ: "یرید الله بکم الیسر ولا یرید بکم العسر" وقوله تعالیٰ: "ما جعل علیکم فی الدین من

حرج" وفی الحدیث: "أحب الدین إلی اللہ تعالیٰ الحنفیة السمحة، قال العلماء فیخرج علی هذه القاعدة جمیع رخص الشرع وتخفیفاته"۔ (ص۔ ۵۰)

پھر اس کے بعد صاحب اشباہ نے بتایا ہے کہ اسباب تخفیف سات ہیں ان میں سے ایک سبب ''عسر'' (دشواری) بھی ہے اور عسر کی صورت میں یسر کا شریعت میں کتنا لحاظ ہے، اس کے لئے بیسوں فقہی جزئیات مختلف نوعیت کے بیان کیا ہے، اس میں ایک جزئی ایسی بھی بیان میں آئی ہے جو شرعاً اپنی جوہریت کے اعتبار سے ربوی ہے اور وہ ''بیع الوفاء''(۱) کا مسئلہ ہے، اشباہ کے الفاظ یہ ہیں:

"ومن هذا القبیل بیع الأمانة المسمی ببیع الوفاء، جوزه مشائخ بلخ وبخارا توسعة وبیانه فی شرح الکنز من باب خیار الشرط" (ص۵۳)

دوسطر اس سے پہلے لکھا ہے:

"وبیع الموصوف فی الذمة کالسلم جوز علی خلاف القیاس دفعا لحاجة الناس"۔

(۱) بیع الوفاء: ایسی خرید وفروخت، جس میں خریدار کی طرف سے یہ وعدہ ہو کہ جب فروخت کنندہ اسے پیسہ ادا کرے گا تو وہ اسے یہ شئی واپس کردے گا اور اپنے وعدہ کو وفا کرے گا، مثلاً: ''الف'' کے ہاتھ ایک ہزار روپیہ میں کوئی شئی فروخت کرلے اور یہ بات طے پائے کہ بیچنے والے کے پاس اگر ایک ہزار روپئے ہوجائیں اور وہ رقم خریدار کو ادا کردے تو خریدار وہ سامان اسے واپس کردے گا۔

گویا اصل میں مقصد ''الف'' کا ایک ہزار روپیہ ''ب'' سے بطور قرض حاصل کرنا ہے لیکن اگر یہ رقم قرض کے عنوان سے حاصل کی جاتی ہے اور اس کے بدلے میں وہ شئی اس کے پاس رہن رکھی جاتی ہے تو ''ب'' کے لئے اس شئی سے نفع اٹھانا جائز نہیں ہوتا، کیوں کہ قرض دہندہ رہن سے نفع نہیں اٹھا سکتا، ورنہ یہ سود میں شمار ہوگا، اس لئے اس معاملہ کو بیع کے عنوان سے کیا جاتا ہے۔

یہ خرید وفروخت کی خاص صورت ہے جو بعد کے زمانہ میں مروج ہوئی۔ (ملاحظہ ہو: قاموس الفقہ ج ۲/ ۳۶۶)۔

سوال نمبر سوم کا جواب:

ایسے مقامات جہاں اقتدار اعلیٰ مسلمان کو حاصل ہے اور بلا سودی قرض کا نظام جاری کرنا بھی اس کے اختیار میں ہے اور ایسے مقامات کے درمیان جہاں اقتدار اعلیٰ غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے اور مسلمان کو اس میں کسی قسم کا اختیار نہیں ہے تو کوئی فرق ہوگا یا نہیں، اگر ہوگا تو کیا؟

اس تمہید کا جواب یہ ہے کہ ایسے مقامات میں جہاں اقتدار اعلیٰ مسلمان کو حاصل ہے اور بلا سودی قرض کا نظام کرنا بھی اس کے اختیار میں ہے جس کی تعبیر فقہاء کی اصطلاح میں دارالاسلام سے ہے، وہاں سودی لین دین ناجائز ہوگا، اور سود خوار مستحق تعزیر ہوگا، تفسیر مظہری میں "یا أیها الذین آمنو اتقوا الله وذروا ما بقی من الربوا إن کنتم مؤمنین، فإن لم تفعلوا فأذنوا بحرب من الله ورسوله" کے تحت لکھا ہے:

"قال البیضاوی: ذلك یقتضی أن یقاتل المربی بعد الاستتابة حتی یفیئ إلی أمر الله کالباغی، قلت: الظاهر أنه إن لم یکن له منعة یجب علی الإمام أن یحبسه حتی یتوب، و إن کان له منعة لا یقدر الإمام علی حبسه فهو الباغی یقاتل منه حتی یفیئ إلی أمر الله" (ج ۱، ص ٤١١)

دارالاسلام میں جس طرح مسلم کا مسلم سے سودی لین دین ناجائز ہے اسی طرح دارالاسلام میں وہاں کے غیر مسلم باشندے سے بھی سودی لین دین جائز نہیں ہے، ''نصاب الاحتساب''(۱) میں ہے:

"إن فیما سوی الخمر والخنزیر ونکاح المحارم وعبادة غیر الله تعالی حال أهل الذمة کحال المسلمین،

(۱) نصاب الاحتساب، فقہ حنفی کی کتاب ہے، اس کے مؤلف شیخ عمر بن محمد بن عوض سَنامی حنفی (ت: ۷۳۴ھ) ہیں۔

ما یمنع عنه المسلم، یمنع عنه أهل الذمة" (نقله من فتاوی مولانا عبدالحیؒ(۱))

اسی طرح مستامن سے (یعنی اس غیر مسلم سے جو دارالحرب سے امان لے کر دارالاسلام میں آیا ہو) دارالاسلام میں سودی لین دین ناجائز ہے، وجہ اس کی ہدایہ وغیرہ میں یہ ہے کہ "لأن ماله صار محظورا بعد الأمان" بخلاف اس کے، ان مقامات میں جہاں اقتدار اعلی غیر مسلم کے ہاتھ میں ہو اور وہاں سودی لین دین ان کے ملکی قانون کی رو سے رائج ہو تو ایسے مقامات میں حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ کے مسلک پر مسلمانوں کو وہاں کے غیر مسلموں سے سودی لین دین کرنا جائز ہوگا۔ امام ابو یوسفؒ اور امام شافعیؒ کا اس میں اختلاف ہے اور یہ ایسا مسئلہ ہے جو فقہ کی تمام کتابوں میں بالتصریح مذکور ہے۔ مثلاً مبسوط میں ہے:

"قال رحمه الله ذكر عن مكحول عن رسول الله ﷺ قال: "لا ربا بين المسلمين وبين أهل الحرب فى دارالحرب" وهذا الحديث إن كان مرسلا، فمكحول فقيه، ثقة مقبول، هو دليل لأبى حنيفة ومحمد رحمهما الله فى جواز بيع المسلم الدرهم بالدرهمين من الحربى فى دار الحرب، وعند أبى يوسف و الشافعى رحمهما الله لا يجوز، وكذلك لو مالهم ميتة أو قامرهم وأخذ منهم مالا بالقمار، فذلك المال طيب له عند أبى حنيفة ومحمد رحمهما الله خلافا لأبى يوسف والشافعى رحمهما الله" (ج١٤، ٦٥)

شامی میں ہے:

"وفى السير الكبير وشرحه حيث قال: وإذا دخل

(۱) مجموعہ فتاوی مولانا عبدالحی، جلد سوم، ص۱۰۸ (فارسی)، مطبع یوسفی فرنگی محل لکھنو، ۱۹۲۶ء بار نہم۔

المسلم دارالحرب بأمان، فلا بأس أن يأخذ منهم أموالهم بطيب أنفسهم بأى وجه كان، لأنه إنما أخذا لمباح على وجه عري عن الغدر، فيكون ذلك طيبا، والأسير والمستأمن سواء حتى لو باعهم درهما بدرهمين، أو باعهم ميتة بدراهم أو أخذ مالا منهم بطريق القمار فذلك كله طيب له" (ردالمحتار، دارالكتب العلمية، ج ٧، ص٤٢٣۔باب الربوا)

درمختار میں ہے:

"ولا ربوا بين حربى ومسلم مستأمن ولو بعقد فاسد أو قمار ثمة، لأن ماله ثمة مباح فيحل برضاه مطلقا بلا عذر، خلافا للثانى والثالثة" ۔ (ردالمحتار، ج٧/٤٢٢-٤٢٣، باب الربا، دارالكتب العلمية، بيروت، لبنان، ط: ۲۰۰۳ء)۔

ہدایہ میں ہے:

"ولا بين المسلم والحربى فى دارالحرب خلافا لأبى يوسف والشافعى، لهما الاعتبار بالمستأمن منهم فى دارنا، ولنا قوله ﷺ: لا ربوا بين المسلم والحربى فى دارالحرب" ولأن مالهم مباح فى دارهم، فبأى طريق أخذه المسلم أخذ مالا مباحا، إذا لم يكن فيه عذر، بخلاف المستأمن منهم لأن ماله صار محظورا بعقد الأمان" (هداية: ٨٦/٣)۔

البحر الرائق میں ہے:

"قولہ: ولا بین الحربی والمسلم ثمہ، ای لا ربوا بینھما فی دار الحرب عندنا خلافا لأبی یوسف، وفی البنایة وکذا إذا باع خمرا أو خنزیرا أو میتة أو قامرھم وأخذ المال، کلہ ذلك یحل لہ" ۔ (البحرالرائق ۲۲۶/۶، دارالکتب العلمیة، بیروت)۔

ھذا ما سنح لی، فإن أصبت فمن اللہ، وإن أخطأت فمنی ومن الشیطان۔

عبدالصمد رحمانی
دارالتالیف، مانڈروایا کھگڑیا، مونگیر، بہار

☆☆☆☆

جواب مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی ندویؒ☆

جامعہ ملیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

(۱) بیمہ کے سلسلہ میں آپ کا فیصلہ عام طور پر پسند کیا جارہا ہے، لیکن دارالحرب کی بناء

☆ مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی (پ: ۷/مارچ ۱۹۰۷ء-ت: ۲۴/اگست ۱۹۷۹ء) دارالعلوم میں تعلیم وتدریس، ندوۃ العلماء کی تعمیر وترقی، "الندوۃ" (دورسوم) کی ادارت وذمہ داری، پھر "ادارۂ تعلیمات اسلام" کے قیام واستحکام اور اس کے ذریعہ قرآن مجید کی خدمت اور عربی زبان کی تعلیم واشاعت اور اس کے ترجمان اخبار "تعمیر" کی ادارت وترتیب میں مولانا علی میاں ندوی اور قدوائی صاحب ایک دوسرے کے رفیق کار اور شریک حال رہے، پھر ندوۃ العلماء کے کاموں میں بحیثیت معتمد تعلیمات ان کے گراں قدر مشورے، دارالمصنفین میں بحیثیت شریک ناظم ان کی قیمتی رہنمائی اور مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کی پوری پوری نیابت، ایسے عنوانات ہیں جن کی تفصیل یہاں ممکن نہیں۔

عام معلومات اور مطالعہ کے وسعت وتنوع میں رفقاء پر فائق تھے، اردو کے اچھے مقرر اور مضمون نگار اور کامیاب مصنف تھے، سلامت طبع، ذہنی اعتدال، تواضع اور شرافت نفس کی دولت سے بہرہ ور تھے، نصاب تعلیم کے تغیر پذیر اور علوم اسلامیہ کے ترقی پذیر ہونے پر پختہ عقیدہ تھا، ان کے نزدیک ان میں زمانہ کے ساتھ دینے بلکہ اس کی قیادت کرنے اور اس کے جائز تقاضوں کے پورا کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے، سیاسی خیالات میں وہ تحریک خلافت سے متأثر تھے، ۱۹۳۴ء میں ندوہ کے حلقۂ تدریس سے وابستہ ہوئے، اور نہ صرف درجہ کے استاد تھے بلکہ طلبہ کے اتالیق ونگراں اور ان کے مطالعہ اور علمی ترقی کے مشیر ورہنما بھی تھے، طلبہ کی انجمن "الاصلاح" کے وہ ناظم بھی رہ چکے تھے اور اس کی افادیت کے بڑے قائل تھے، طلبہ کو اس کے ذخیرہ کتب اور رسائل سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتے رہتے تھے، جس کے نتیجہ میں بہت سے ذہین طلبہ اچھے مضمون نگار اور صحافی اور مصنف بن گئے۔

جنوری ۱۹۴۰ء میں "الندوہ" کے سہ بارہ اجراء پر شریک ادارت رہے، ۱۹۴۳ء میں بعض خاص حالات کی بنا پر دارالعلوم سے علاحدگی اختیار کرلی، اور لکھنؤ کے چند اصحاب ذوق، عالی ہمت عمائد کے تعاون سے "ادارہ تعلیمات اسلام" کی بنیاد ڈالی، اس کے تحت قرآن مجید کے فہم ومطالعہ اور کم سے کم قواعد کی مدد سے عربی زبان (بقیہ اگلے صفحہ پر)

پر جواز کا فتوی ٹھیک نہیں ہے ہندوستان کو دارالحرب قرار دینا صحیح نہیں ہے، یہاں اقتدار اعلی میں مسلمان بھی شریک ہیں، وہ دستور مملکت کے اعتبار سے محکوم نہیں بلکہ شریک حاکمیت ہیں، تعداد کی کمی کی وجہ سے ان کا حصہ خواہ انتظام مملکت میں کم ہو لیکن ہیں وہ شریک حکومت، ایسی صورت میں اس ملک کو دارالحرب قرار دینا صحیح نہیں ہے، اس غلط خیال کی اشاعت سے مسلمانوں کے ذہن پر بھی برا اثر پڑے گا اور غیر مسلموں کے دلوں میں بھی ان کی بابت سوءظن پیدا ہوگا، مسلمانوں کی ہمت پست ہوجائے گی، ان میں محکومانہ روح پیدا ہوجائے گی، فرقہ پرست جماعتوں کو مسلمانوں کی بے اعتباری کا ثبوت مل جائے گا اور ان کو اقتدار اعلی میں شرکت سے محروم کرنے کا موقع مل جائے گا۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) سکھانے کا بیڑا اٹھایا، ''عربی زبان کے دس سبق'' کے نام سے ایک کتابچہ تیار کیا جو بہت مقبول ہوا اور بہت سے مدارس میں یہ داخل نصاب ہے، اسی طرح ''تمرین الدروس (۱-۳) اور قرآن مجید کی پہلی، دوسری، تیسری کتاب کا سلسلہ بھی شروع کیا، ۱۹۴۸ء میں ''تعمیر'' کے نام سے ایک دینی رسالہ کا اجراء کیا، ۱۷/اگست ۱۹۵۱ء میں جامعہ اسلامیہ کے شعبۂ دینیات کی نظامت کی پیش کش پر جامعہ منتقل ہوگئے، اور ۳۰/اپریل ۱۹۷۲ء میں رٹائر ہوئے، ۵/اکتوبر ۱۹۷۲ء کو دارالعلوم کے معتمد تعلیمات منتخب ہوئے اور ۱۹۷۵ء کے پچاسی سالہ تاریخی جشن میں ندوۃ العلماء میں اپنی فاضلانہ رپورٹ پڑھی۔

مرحوم اردو کے ایک منجھے ہوئے پختہ کار وکہنہ مشق لکھنے والے تھے، ان کی تحریر میں زبان یا محاوروں کی غلطی ڈھونڈنے سے نہیں ملتی تھی، ان کا طبعی اور پسندیدہ موضوع تاریخ تھا، اس میں ان کے قلم کے دو نقش ''ہماری بادشاہی'' (مختصر تاریخ اسلام) اور ''ہندوستان کی کہانی'' (مختصر تاریخ ہند) اہل علم ونظر سے داد تحسین لے چکے ہیں، اور بہت جگہ نصاب میں داخل ہیں، اسی طرح ''دنیا اسلام سے پہلے اور اس کے بعد'' بھی مقبول ہے۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کی وفات کے بعد دارالمصنفین میں قیام کیا اور ''معارف'' کی ادارت کی۔

۳۰/رمضان ۱۳۹۹ھ عید کی چاند رات، جمعہ کے دن اذان کے وقت ان کی روح نے اپنے مرکز اصلی کی طرف پرواز کی اور یکم شوال کو عیدگاہ میں دوگانہ ادا کرنے کے بعد سپرد خاک ہوئے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ (مزید تفصیل کے لئے پرانے چراغ، حصہ دوم-تعمیر حیات کا خصوصی نمبر ملاحظہ کریں۔)

(۲) ترقیاتی کاموں کے لئے سودی قرض کے سلسلہ میں عرض ہے کہ اسے باضابطہ جواز کا درجہ نہ دیجئے بلکہ مبتلی بہ کے حالات پر چھوڑ دیجئے، اشتراک باہمی کے سلسلہ میں قریبی مشاہدہ کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ذرا سی بے احتیاطی مبتلائے مصائب کر دیتی ہے، اس لئے جہاں تک ہوسکے قرض سے اجتناب کیا جائے۔ فقط

عبدالسلام قدوائی

☆☆☆☆

حکومت اور تجارتی قرض

الحاج مولانا سید شمس الحق صاحبؒ ☆
(سابق) شیخ الحدیث جامعہ رحمانی خانقاہ، مونگیر

ربوا لغت میں زیادتی کے معنی میں ہے اور شرع میں ربوا اس زیادتی کو کہتے ہیں

☆ مولانا سید شمس الحق (پ: ۱۹۱۶ء- ت: ۲۵ رنومبر ۲۰۰۷ء) چک اولیاء، ضلع ویشالی، بہار جائے ولادت ہے، والد ماجد جناب سید محمد ابراہیم صاحب اور برادر محترم مولوی منظور الحق صاحب سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، عربی تعلیم مدرسہ احمدیہ ابابکر پور، مدرسہ شمس الہدی پٹنہ، اور دار العلوم دیوبند میں حاصل کی اور جب علامہ کشمیری کا قافلہ دیوبند سے ڈابھیل، گجرات گیا تو آپ بھی چلے گئے، اور ۹ رشعبان ۱۳۵۶ھ کو فراغت حاصل کی، بخاری شریف علامہ شبیر احمد عثمانی سے پڑھی اور ان ہی کے ہاتھوں دستار بندی ہوئی، اجلاس دستار بندی میں مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید دہلوی بھی موجود تھے۔

فراغت کے بعد مختلف اداروں میں درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے ہوئے ۱۹۶۵ء میں جامعہ رحمانی مونگیر آئے اور فریش ہونے تک درس کی خدمت انجام دیتے رہے، آپ کے ممتاز تلامذہ میں مولانا فضل الرحمٰن رحمانی، مولانا رضوان القاسمیؒ، مولانا عبدالسبحان رحمانی (مقیم کویت)، مولانا عبد الحق رحمانی اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی وغیرہ ہیں، ۱۹۷۰ء-۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۴ء میں حج کی سعادت سے سرفراز ہوئے، احسان وتصوف سے شروع سے تعلق رہا، خود اپنے استاد علامہ شبیر احمد عثمانیؒ سے بیعت ہوئے، پھر امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی سے اور ان ہی سے مجاز قرار پائے۔

علم وفضل اور ورع وتقوی کے ساتھ ظاہری شباہت اور چال ڈھال میں منفرد حیثیت رکھتے تھے، نرم خو، شفیق، منکسر المزاج، صف اول کے ساتھ نماز باجماعت کے پابند، سنن ونوافل، تلاوت قرآن اور ماثور اوراد وادعیہ کا حد درجہ اہتمام کرنے والے تھے، علم مستحضر اور استعداد پختہ تھی، جامعہ رحمانی، مونگیر میں شیخ الحدیث رہے، علاقہ میں کثرت سے اصلاحی ودعوتی اسفار کرتے اور عام فہم اور سادہ انداز میں خطاب کرتے، درسی مشاغل نے تصنیف وتالیف کا زیادہ موقع نہیں دیا، لیکن پھر بھی جو کچھ لکھتے شستہ اور آسان زبان میں لکھتے، آپ کے کئی اصلاحی مضامین مختلف رسائل (بقیہ اگلے صفحہ پر)

جو عوض سے خالی ہو۔

"الربوا فی اللغة: الزيادة، وفی الشرع هو فضل مال بلا عوض فی معاوضة مال بمال" (عينی) (۱)

"قال فی الجوهرة: هو... عبارة عن عقد فاسد بصفة، سواء كان هناك زيادة أو لا، ألا ترى أن بيع الدراهم بالدراهم نسيئة رباً وليس فيه زيادة"۔ (الجوهرة النيرة، ج ۱/ ۲۱٤، باب الربا)۔

اسلام نے اس تبادلہ کو جو خالی عن العوض ہو منع کیا ہے، اس کے علاوہ بھی دوسرے اقسام ربوا کو بھی حرام قرار دیا ہے، مثلاً دراہم کی بیع دراہم کے ساتھ نسیئۃ بلکہ حضور ﷺ نے فرمایا: "كل قرض جر منفعة فهو وجه من وجوه الربوا" (بيهقی ص ۳۵۰۔ كتاب البيوع)

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) میں شائع ہو چکے ہیں، آپ کی تالیفات میں "مقامات بدیع الزماں ہمدانی" کے دس مقامات کی شرح "تسہیل المعانی" اور "تسہیل العربیہ" مطبوعہ ہیں، "سفرنامۂ حج دربار حرم" اسی طرح درسی یادداشت کے مختصر اشارات "جہد البہاری فی حل البخاری" اور "غنیۃ المبتدی فی حل الترمذی" غیر مطبوعہ ہیں۔

شعر وسخن کا بھی بڑا اعلی ذوق تھا، اصلاحی اور تذکیری اشعار خود بھی کہتے اور دوسروں کے بھی سناتے، پارۂ عم کا منظوم ترجمہ بھی فرمایا، اور "عوامل النحو" کے نام سے نحو کے عوامل کو بھی نظم کیا۔

علم وتحقیق اور ورع وتقوی کا یہ آفتاب جہاں تاب ۱۳ رذی القعدہ ۱۴۲۸ھ مطابق ۲۵ رنومبر ۲۰۰۷ء کو اپنے وطن میں غروب ہو گیا، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔ (مزید کے لئے دیکھیں: وہ جو بیچتے تھے دوائے دل از: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)۔

شیخ الحدیث جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر، قاضی شریعت مونگیر، رکن مجلس شوری امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، سرپرست وبانی مدرسہ اسلامیہ شمسیہ چک معین الدین، مدرسہ اسلامیہ اماموری پاتے پور اور ان کے علاوہ بہت سے مدرسوں کے بانی وسرپرست رہے۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: پس مرگ زندہ: ص ۷۹۰-۷۹۷)۔

(۱) عینی شرح کنز الدقائق، ج ۳، باب فی بیان احکام الربا، ص: ۹۴۔ (مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ)
کذا فی البنایۃ، ج ۸، باب الربا، ص: ۳۶۰۔ (المکتبۃ النعیمیۃ، دیوبند)

جو قرض بھی نفع کھینچتا ہے وہ سود ہی کے اقسام میں سے ہے، اسلام نے زمانہ جاہلیت کے مروجہ طریقۂ سود کے علاوہ ان تمام شکلوں کا سد باب کیا جن کا آخری نتیجہ سود کی طرح بغیر محنت کی کمائی نکلتا تھا اور ان سب کو سود ہی قرار دیا۔

حرمت ربا از کتاب وسنت

ربا کی حرمت نص قطعی سے ثابت ہے:

قال الله تعالى: "وأحل الله البيع وحرم الربوا" وقال الله تعالىٰ: "لا تأكلوا الربوا أضعافا مضاعفة"۔ (آل عمران: ۱۳۰)۔

اسلامی عقیدہ کے مطابق آخری حد یہ ہے کہ سود کو کفر میں شامل کیا گیا ہے:

"يمحق الله الربوا ويربى الصدقات، والله لا يحب كل كفار أثيم"، (بقرہ: ۲۷۶)۔

آیات مذکورہ کے علاوہ اور بھی متعدد آیات ہیں جن سے ربوا کی حرمت وشناعت ظاہر ہوتی ہے، ربوا کی حرمت وشناعت کے بارے میں بکثرت احادیث ہیں:

عن جابرؓ قال: "لعن رسول الله ﷺ آكل الربوا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال هم سواء" (مسلم: كتاب البيوع، باب لعن آكل الربا وموكله، ح: ۱۵۹۸)

وعن ابن مسعودؓ قال رسول الله ﷺ: "الربوا سبعون جزءاً أيسرها أن ينكح الرجل أمه"۔ (ابن ماجه، كتاب التجارات، باب التغليظ فى الربا، ح: ۲۲۷۴)۔

سود دولت اور سرمایہ کو بعض افراد اور گروہ میں مخصوص کر دینے کا سبب بن جاتا ہے اور ایک کو تباہ وبرباد کر کے دوسرے کے بظاہر فائدہ کی صورت نکالتا ہے، یہ فائدہ دراصل فائدہ نہیں بلکہ بربادی ہے، اسلام نے سودی کاروبار کے تمام اقسام کو حرام قرار دیا اور

بے محنت کی اس کمائی کو ظلم قرار دیا۔

زمانۂ جاہلیت اور سود

زمانۂ جاہلیت میں بھی آج کی طرح مشرکین اور بالخصوص یہودیوں میں سود کے لین دین کے مختلف طریقے رائج تھے:

(۱) ایک طریقہ یہ تھا کہ صاحب ضرورت کو نقد قرض دیتے تھے اور اس کی ادائیگی کی مدت مقرر کر دیتے اور اس ادھار پر شرح سود مقرر کر دیتے تھے۔
(درمنثور ص۳۶۶ ج۱)

(۲) مدت معین پر مقروض نے قرض ادا نہیں کیا تو سود اور اصل قرض کو ملا کر اپنی اصلی رقم قرار دیتے اور اس مجموعہ پر سود لگا دیتے جس کو سود در سود کہتے ہیں۔
(درمنثور ص۳۶۶)

(۳) زیور، ہتھیار وغیرہ رہن رکھتے اور اس کی کم سے کم قیمت لگاتے اور معین مدت کا سود لگا کر ان کو ہضم کر لیتے۔ (سیرۃ النبی ص۲۲۲ ج۴، مؤطا مالک ص۳۰۴)

(۴) زمانۂ جاہلیت میں سود شخصی بھی تھا اور تجارتی بھی۔ یعنی ایک صورت تو یہ ہے کہ کوئی شخص مجبوری کی حالت میں قرض لے کر اپنی ضرورت پوری کرے اور معین سود ادا کرے اور دوسری صورت یہ ہے کہ جماعتی حیثیت سے کوئی کاروبار ہو اور تجارت کو فروغ دینے کے لئے سودی قرض لیا جائے جیسے اس زمانہ میں ایک کمپنی دوسری کمپنی کو سود دیتی ہے، اسلام نے سود کے تمام اقسام یعنی شخصی اور جماعتی کو حرام قرار دیا۔ حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر حضرت عباسؓ کا جو سود وضع کیا تھا وہ اسی قسم کا تھا، یعنی وہ سود شخص واحد پر نہ تھا بلکہ قبیلۂ بنی ثقیف نے اپنے کاروباری معاملے میں حضرت عباسؓ سے سودی قرض لیا تھا، حضور ﷺ نے اس سود کے وضع کرنے کا اعلان فرمایا۔ (درمنثور ص۳۶۴ ج۱)

"وربا الجاهلية موضوع وأول ربوا أضع من ربانا

ربا عباس بن عبدالمطلب فإنه موضوع كله"۔ (مسلم:
كتاب الحج، باب حجة النبی ﷺ، ح: ۱۲۱۸)۔

تجارت اور سود

مشرکین عرب تجارت اور سود میں فرق نہیں کرتے تھے، وہ کہتے تھے کہ خرید وفروخت اور تجارتی کاروبار اسی طرح کی چیز ہے جیسا کہ سود کا لین دین۔

"قالوا إنما البيع مثل الربوا" (بقرة)

گویا ان کی نگاہ میں سود کا معاملہ ایسا صحیح کاروبار تھا کہ بیع وشراء کو اس پر قیاس کرتے تھے مگر قرآن نے صاف لفظوں میں اعلان فرمادیا:

"وأحل الله البيع و حرم الربوا" (بقرة:۲۷۵)

بیع میں جو نفع ہوتا ہے وہ مال کے مقابلے میں ہوتا ہے جیسے کسی نے ایک درہم کی قیمت کا کپڑا دو درہم میں فروخت کیا، اور سود وہ ہوتا ہے جس میں نفع بلاعوض ہو جیسے ایک درہم سے دو درہم خریدے، کپڑا اور درہم دو الگ الگ چیزیں ہیں ان میں فی نفسہ موازنہ ومساوات غیر ممکن ہے۔ پس یہ تبادلہ بضرورت ہوتا ہے اور ہر شخص کی ضرورتیں مختلف ہوتی ہیں، کسی کو دس درہم کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنا کہ ایک کپڑے کی، غرض ان دو مختلف چیزوں میں موازنہ کی صورت سوا حاجت اور ضرورت کے کچھ نہیں۔ لہذا اگر ایک درہم کا کپڑا دس درہم میں بیچا تو یہ ضرورت ہی ان دونوں میں مساوات پیدا کرتی ہے اور اس کو سود نہیں کہہ سکتے اور درہم کو درہم کے ساتھ تو مساوات ہے، تو تبادلہ میں ایک درہم دوسرے درہم کے مقابلے میں ہوگا اور دوسرا درہم بلا مقابلہ خالی عن العوض ہو کر سود ہوگا جو حرام ہے۔
(ماخوذ از فوائد حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ)

پھر تاجر اپنی محنت اور وقت کا معاوضہ لیتا ہے اور سود خوار بلا محنت ایک مجبور اور حاجتمند کی کمائی کا حصہ چھینتا ہے اور یہ ظالمانہ طریق کار ہے۔

بینک اور کوآپریٹو سوسائیٹیاں

موجودہ دور میں بینک کا معاملہ بھی ترقی یافتہ سود کی شکل ہے، بینکوں کا وجود اس لئے ہے کہ بڑے بڑے سرمایہ داروں کے سرمایہ میں بے پناہ اضافہ ہو اور چھوٹے بڑے تمام کاروبار کا معاملہ چند سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں آجائے، کوآپریٹو سوسائٹی اگرچہ غریب کاشتکاروں اور مزدوروں کو سستے قرض دیتی ہے لیکن چونکہ یہاں بھی سود کی نجاست موجود ہے اس لئے نتیجہ کے اعتبار سے قرضخواہوں کے لئے باعث وبال بن جاتی ہے اور اس کا مقصد بھی سرمایہ داروں کا مہاجنی کاروبار ہے۔

موجودہ دور میں حکومت کا تجارتی قرض

اس وقت حکومت، ہندوستان کے باشندوں کو اقتصادی بدحالی سے بچانے اور تجارتی وزراعتی لائنوں میں ترقی کے لئے قرض دیتی ہے اور ایسے لوگوں کو جو بے گھر ہیں گھر بنانے کے لئے قرض دیتی ہے، اگر حکومت سے قرض نہ لیں تو گھر بنانے کا کوئی ذریعہ نہیں، حکومت کا مقصد منافع اندوزی اور مہاجنی کاروبار نہیں ہے بلکہ عوام کی اقتصادی فلاح اور ترقی مقصود ہے، حکومت بہت ہی ہلکا شرح سود مقرر کرتی ہے تاکہ اس شعبے کے اخراجات پورے ہوسکیں، حکومت نفع اس طرح وصول کرتی ہے کہ خود قرضخواہ بھی اداء سود کے بعد قرض دہندہ کے مساوی بلکہ زیادہ فائدہ اٹھالیتی ہے، تو سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس قرض لینے کی اجازت ہے یا نہیں، اور کیا یہ بھی ربوا محرم میں داخل ہے؟ بلاسودی قرض ملنا تقریبا محال ہے، اگر مسلمان یہ قرض نہ لیں تو تباہ حال ہو کر اچھوتوں سے بدتر ہو جائیں اور غیر مسلم اقوام ان کی جائداد واموال پر قابض ہو جائیں نیز اگر سرمایہ کی مجبوری کی وجہ سے زمین کی کاشت نہ کرسکیں تو چند سال کے بعد حکومت ایسے زمینداروں کی زمین پر قبضہ کرلیتی ہے۔ موجودہ حکومت غیر اسلامی ہے، جہاں کوئی اسلامی نظام چل نہیں سکتا، تو ایسی مجبوریوں کی صورت میں حکومت سے قرض لے کر مکان بنانا اور کھیتی اور تجارت کرنا جائز ہوگا یا نہیں؟

سود کی حرمت قطعی ہے، یہ امر مجتہد فیہ نہیں ہے، اس لئے اس معاملے میں بہت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ موجودہ وقت میں ناجائز معاملات کی بہت سی ترقی یافتہ شکلیں پائی جاتی ہیں مگر غور کرنے سے وہ سب قمار اور رباء کے اندر داخل ہیں۔ حکومت سے تجارتی قرض کا سود کی تعریف میں داخل ہونا بالکل ظاہر ہے یعنی مقروض جو زیادہ دیتا ہے وہ زیادتی معاوضہ سے خالی ہے۔ مہاجن کا روبار میں بھی تو ایسا ہی ہے کہ ایک ضرورت منداور مضطر اپنی ضرورت پوری کرتا ہے اور پھر اس کو اصل قرض سے زائد دینا پڑتا ہے۔ رہی یہ بات کہ حکومت کا مقصد نفع اندوزی اور کاروبار نہیں ہے بلکہ محض عوام کی اقتصادی فلاح مقصود ہے، محل نظر ہے، شرح سود ہلکا ہی سہی مگر یہ کیونکر کہا جاسکتا ہے کہ حکومت کا اس میں فائدہ نہیں ہے۔ پھر حکومت کے اس معاملے سے جو جتنا زیادہ سرمایہ دار اور زمیندار ہے وہی زیادہ مستفید بھی ہوگا، اس لئے یہ طریقۂ کار آہستہ آہستہ اعتدال سے گذر کر مہلک سرمایہ داری کے لئے راہ کھولتا ہے، کیونکہ اس سے پیدا شدہ خوشحالی زیادہ تر سرمایہ داروں ہی کے لئے ہے، عوام کے لئے برائے نام ہے۔ پھر قرضخواہ کا اداء سود کے باوجود خود فائدہ اٹھالینا امر موہوم ہے۔ اس کے خلاف بھی ہوسکتا ہے، حکومت تو مقررہ شرح لے کر ہی رہے گی، چاہے نفع ہو یا خسارہ، اگر خسارہ ہوا تو نوبت قرقی، ضبطی، نیلام اور بے آبروئی تک پہونچ سکتی ہے اور بارہا اس کا تجربہ بھی ہورہا ہے۔

مسلمانوں کی موجودہ معاشی بدحالی پھر بھی اس درجہ کی نہیں ہے جو عہد رسالت کے مسلمانوں کی تھی، جو صفہ میں اوقات بسری کرتے تھے اور چند کھجوروں پر قناعت کرتے تھے، مرنے پر کفن کے لئے پورا کفن بھی میسر نہیں ہوتا تھا، مگر حضور ﷺ نے ایسی صورت میں بھی صحابہ کو سودی قرض لینے کی اجازت نہیں دی، اس وقت اگر مسلمانوں کو سودی قرض کی حلت کا فتوی دیا جائے تو سود کی شناعت قطعا دلوں سے نکل جائیگی اور جو کام ابھی گناہ سمجھ کر جھجھک کے ساتھ کرتے ہیں، علی الاعلان حلال سمجھ کر کریں گے۔

رہی یہ بات کہ ہندوستان میں اقتدار اعلی کفار کا ہے، نظام کفر غالب ہے، نظام

شرعی کا نفاذ بالفعل ناممکن ہے، یہ خطرہ بھی درست ہے کہ مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی سے کفار ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کے اموال وجائداد پر قابض ہوجائیں گے اور مسلمانوں کی زندگی اچھوتوں سے بدتر ہوجائیگی، کتنے لوگ ایسے ہیں جو بے خانماں ہیں، آسمان کے سایوں میں دن گذارتے ہیں، کتنے ہیں جو مالدار ہیں نان شبینہ کو محتاج ہیں، بلاسودی قرض ملنا ناممکن ہے، اگر سودی قرض نہ لیں تو کھائے بغیر مرجائیں۔ چنانچہ اس آزاد ہندوستان میں لاکھوں آدمی بھوکوں مرگئے، تو شریعت مطہرہ نے اس کے لئے کوئی مخلص ضرور نکالا ہے۔

بحالت اضطرار شریعت نے مردار جیسی چیزوں کو حلال قرار دیا ہے:

وقال الله تعالىٰ: "إنما حرم عليكم الميتة والدم ولحم الخنزير وما أهل به لغير الله، فمن اضطر غير باغ ولا عاد فلا إثم عليه" (بقره: ۱۷۳)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بحالت اضطرار مردار بھی جائز ہے مگر اسی قدر کہ جان بچ سکے، لہذا اگر کوئی شخص اتنا مجبور ہو کہ بلاسودی قرض کے اپنی اور کنبہ کی جان نہیں بچا سکتا تو یہ حالت اضطرار ہے، ایسی صورت میں سودی قرض لینا جائز ہوگا۔ نیز فقہاء کا مسلم اصول ہے کہ "الضرورات تبيح المحظورات" یعنی ضرورت شدیدہ کے وقت اشیاء ممنوعہ جائز ہوجاتی ہیں مگر ضرورت کا درجہ اضطرار سے کم ہے مثلاً ایک شخص بے گھر ہے، تن پر کپڑا نہیں ہے اگرچہ یہ صورتیں ایسی ہیں کہ بالفعل جان تو خطرے میں نہیں ہے مگر ذریعۂ ہلاکت بن سکتا ہے تو ایسی ضرورت شدیدہ کے وقت بھی سودی قرض لینا جائز ہوگا۔ ایک شخص ایسا ہے کہ پولیس کی حراست میں ہے اس کی جان اور آبرو خطرے میں ہے یا امراء جور کی وجہ سے اس کی جائداد واملاک معرض تلف میں ہے اور جائداد واملاک کو بچانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ کچھ دے دلا کر اپنی جائداد کو بچائے یا بلا رشوت دئے ہوئے حق رسی ناممکن ہو تو ان صورتوں میں دفع مضرت کے لئے سودی قرض لے سکتا ہے۔

الحاصل ربوا بہر صورت حرام ہے خواہ ادھار قرض کی صورت میں ہو، شخصی سود ہو یا

تجارتی، بینک سسٹم ہو، یا امدادی سسٹم یا حکومت کا تجارتی قرض۔ مگر بحالت موجودہ جبکہ قانون کفر غالب ہے، نظام شرعی کے نفاذ کی کوئی صورت نہیں کہ اصلاح کی امید ہے تو بحالت اضطرار وضرورت شدیدہ حکومت سے تجارتی قرض لینے کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ یعنی "أهون البليتين" کو اختیار کرنے کی اجازت ہوگی، ضرورت شدیدہ سے مراد یہ ہے کہ اگرچہ بالفعل جان کا خطرہ نہ ہو مگر باعتبار مآل ضیاع نفس ومال وآبرو کا باعث ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ (۱)

☆☆☆☆

(۱) یہ مقالہ پندرہ روزہ ''تعمیر حیات'' لکھنؤ کے ۲۵ راگست ۱۹۷۱ء کے شمارہ میں شائع ہو چکا ہے، اصل مسودہ اور اس مطبوعہ مقالہ کے مابین تقابل کرلیا گیا ہے، (رحمت)۔

جواب مولانا سید احمد عروج قادریؒ ☆

مکرمی ومحترمی.....السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حکومت سے قرض حاصل کرنے کے بارے میں آپ نے جو سوالات کئے ہیں

☆ مولانا سید احمد عروج قادری (۱۹۱۳-۱۹۸۶ء) ضلع اورنگ آباد، بہار کے ایک دینی وعلمی خانوادے میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وطن میں، پھر مدرسہ محمدیہ پٹنہ میں پائی، مدرسہ شمس الہدی، پٹنہ سے سند فضیلت حاصل کی، اس کے بعد بہار کے مختلف مدارس میں درس وتدریس کے فرائض انجام دئے۔

مولانا عروج قادری، مولانا سید ابوالاعلی مودودی کی تحریروں سے متاثر ہوکر ان سے قریب ہوئے اور ۱۹۴۶ء میں جماعت اسلامی کی رکنیت اختیار کرلی، تقسیم ملک کے بعد جب جماعت اسلامی ہند کی تشکیل نو عمل میں آئی تو مولانا اس کے رکن بنے، ۱۹۵۶ء میں رام پور تشریف لائے اور وہاں جماعت اسلامی ہند کی ثانوی درسگاہ میں درس وتدریس کا کام شروع کیا، ایک طویل عرصہ تک مولانا جماعت اسلامی ہند کی مجلس نمائندگان، صوبائی مجلس شوری اور مرکزی مجلس شوری کے رکن رہے ہیں، مرکزی جماعت اسلامی ہند دہلی میں امیر جماعت کی عدم موجودگی میں بارہا آپ نے امارت کی ذمہ داری سنبھالی، اس کے علاوہ مسلمانان ہند کے نمائندہ اور باوقار اداروں، مسلم پرسنل لا بورڈ اور مسلم مجلس مشاورت کے بھی سرگرم ممبر رہے ہیں۔

ماہنامہ ''زندگی''، رام پور، جماعت اسلامی ہند کا ترجمان تھا، ابتدا میں مولانا سید حامد علی اس کے مدیر تھے، ۱۹۶۰ء میں مولانا عروج قادری نے اس کی ادارت سنبھالی اور زندگی کے آخری لمحے (وفات: ۱۷ رمئی ۱۹۸۶ء) تک اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، اور اپنی ادارت کے ۲۶ رسال میں ہزاروں صفحات سپرد قلم کئے اور مختلف علمی وفکری موضوعات پر لکھا۔

فقہ اور تصوف مولانا کے ذوق اور دلچسپی کے دو خصوصی میدان تھے، انہوں نے ان دونوں (بقیہ اگلے صفحہ پر)

ان کے مختصر جوابات ذیل میں درج کررہا ہوں۔

(۱) جس سود پر ربا الجاہلیہ (جس کو قرآن نے حرام قرار دیا ہے) کی تعریف صادق آتی ہے وہ سود ہی رہے گا، عام ازیں کہ اس پر ٹیکس کی تعریف صادق آتی ہو یا نہ آتی ہو، حکومت، قرض پر جو سود لیتی ہے وہ اس کے سودی نظام کا ایک جز ہے، اس لئے وہ خود اس کو ٹیکس نہیں کہتی بلکہ انٹرسٹ قرار دیتی ہے۔ جو شخص بھی سود پر حکومت سے قرض لیتا ہے وہ اس کے سودی نظام کو تقویت پہنچاتا ہے۔ ملک اور مصرف کے عام ہونے سے اس کے سود ہونے پر کوئی اثر نہیں پڑتا، فرض کیجئے کہ سودی کاروبار کرنے والی کوئی جماعت اس کا اعلان کرے اور اس پر عمل کرکے بھی دکھادے کہ اس کو سود سے جو رقم حاصل ہوگی وہ اپنے مصرف میں نہ لائے گی بلکہ فقراء ومساکین یا رفاہ عامہ کے کاموں پر صرف کرے گی تو کیا اس کی وجہ سے سود، سود باقی نہ رہے گا؟ یقیناً باقی رہے گا؟

اس حقیر کی قطعی رائے ہے کہ حکومت سے سود پر قرض لینے کا معاملہ ناجائز ہے اور اس کو مباح قرار دینا صحیح نہیں ہے۔

(۲) کسی بھی مصلحت کی وجہ سے سود پر قرض لینا جائز نہیں، سودی قرض لینے کی گنجائش صرف اضطرار کی حالت میں نکل سکتی ہے، اضطرار کا مطلب یہ ہے کہ اگر سودی

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) موضوعات پر بھی خوب داد تحقیق دی ہے، اور ان کے قلم سے وقیع اور مؤثر تحریریں منظر عام پر آئی ہیں، فقہ پر مولانا کی گہری نظر تھی، مسلم پرسنل لا اور بعض دیگر فقہی موضوعات پر ان کی وقیع تحریریں شاہد عدل ہیں، وہ اگرچہ حنفی مسلک کے پابند تھے اور اپنی تحریروں میں اسی کی نمائندگی کرتے تھے مگر ان میں جمود نہ تھا۔

متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہیں، مثلاً: حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، امت مسلمہ کا نصب العین، اقامت دین فرض ہے، اسلامی تصوف، عشر وزکوۃ اور سود کے چند مسائل اور ''حضرت یوسف۔ قرآن کے آئینے میں'' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ مندرجہ بالا معلومات ڈاکٹر رضی الاسلام صاحب ندوی کی ایک تحریر سے اخذ کی گئی ہیں، وہ مرحوم کی تحریریں یکجا کرکے کتابی صورت دینے کا کام کررہے ہیں، مرحوم سے متعلق مزید معلومات ماہنامہ ''زندگی نو'' جون وجولائی ۱۹۸۶ء کے شمارے سے حاصل کی جاسکتی ہیں اور دیگر تفصیلات بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔

قرض نہ لیا جائے تو شدید مالی نقصان پہنچ جائے گا۔ مثال کے طور پر سودی قرض نہ لینے کی وجہ سے کھیت کا اپنے قبضہ وملکیت سے نکل جانا میرے نزدیک شدید مالی نقصان میں داخل ہے۔

(۳) اس سوال کا جواب دینے سے پہلے مجلس تحقیقات شرعیہ کے محترم اراکین کی خدمت میں چند باتیں، بہت ادب کے ساتھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں:

(الف) ان مسائل میں طرفین رحمہما اللہ کے مسلک کو سامنے رکھ کر فیصلے کرنے سے پہلے آپ حضرات پوری سنجیدگی سے تمام پہلوؤں پر غور کرکے یہ بنیادی فیصلہ کریں کہ ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں؟ اس ملک کو دارالحرب قرار دینے سے پہلے ان ائمہ کے مسلک کا حوالہ دینا اور اس کی بنا پر کسی مسئلے میں فیصلہ کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

(ب) جہاں تک راقم الحروف کا خیال ہے ہندوستان کے دستور اور یہاں مسلمانوں کے قیام کی حیثیت اور پوزیشن کو دیکھتے ہوئے اس ملک کو دارالحرب قرار دینا کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے بلکہ بے حد پیچیدہ ہے۔ فقہائے سابقین کی صرف کسی عبارت کو سامنے رکھ کر اس ملک کو دارالحرب قرار دینا مناسب نہیں ہے بلکہ پہلے زمانے کے کسی دارالحرب اور موجودہ ہندوستان کے حالات وتغیرات کو سامنے رکھنا بھی ضروری ہے۔

(ج) اگر اس ملک کو دارالحرب قرار دینا ہو تو یہ بات بھی سامنے رکھنی چاہئے کہ پھر تمام مسائل میں اس کو دارالحرب قرار دیا جائے، صرف غیر مسلمین سے مالی انتفاع کے حق کو پیش نظر رکھ کر یہاں کے مسلمانوں کو مالی نفع پہنچانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ مثال کے طور پر فقہائے احناف، دارالحرب میں کسی مسلمان کے برضاء ورغبت مستقل قیام کو جرم قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف ہجرت ضروری ہے اور صورت حال یہ ہے کہ ہم سب کے سب اعلان کرتے

رہتے ہیں کہ ہندوستان ہمارا وطن ہے اور یہیں ہمیں مرنا اور جینا ہے۔ دارالحرب سے متعلق فقہ حنفی کے ایک جزئے کو نظر انداز کرنا اور صرف مالی انتفاع والے جزئے کو سامنے رکھنا ہرگز مناسب نہ ہوگا، اگر ایسا کیا گیا تو مجلس تحقیقات شرعیہ کا وقار اس سے متأثر ہوگا۔

(د) سوال میں مسلمانوں کے اقتدار اعلیٰ یا عدم اقتدار اعلیٰ کی بنا پر جس فرق کے بارے میں ہماری رائے دریافت کی گئی ہے، اس سلسلے میں پہلے یہ عرض ہے کہ اسلامی شریعت میں بالاتفاق اقتدار اعلیٰ صرف خدا کو حاصل ہے، اس لئے سوال کی اس عبارت پر غور فرما لیا جائے جہاں تک میرا خیال ہے مسلمانوں کے اقتدار اعلیٰ کی اصطلاح سے محترم داعی کی مراد وہ اسلامی حکومت ہے جہاں اسلامی شریعت کے قوانین نافذ ہوں، لیکن عبارت سے یہ بات واضح نہیں ہوتی، محض مسلمانوں کے برسر اقتدار ہونے کی وجہ سے کوئی ملک دارالاسلام نہیں ہو جاتا، اگر وہاں اسلامی قوانین کے بجائے انسان کے وضع کردہ قوانین نافذ ہوں تو شرعی اصطلاح میں وہ دارالاسلام نہیں ہے۔

اصل سوال کا راقم الحروف کی طرف سے جواب یہ ہے کہ سود دارالحرب اور دادالاسلام دونوں جگہ حرام ہے اور اس کی حرمت کے لحاظ سے دونوں ملکوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

سید احمد قادری

۱۱/اپریل ۱۹۶۶ء

رام پور

☆☆☆☆

جواب مولانا محمد وجیہ صاحب، سندھ، پاکستان ☆

حامداً ومصلیا ومسلماً

(۱) اصل چیز اس پر غور کرنا ہے کہ ربا کی حقیقت کیا ہے اور فقہاء نے جو تعریف کی ہے وہ صادق آتی ہے یا نہیں؟ اگر تعریف صادق آتی ہے ربا ہے، ورنہ نہیں۔ بعض نے تعریف کی ہے:

(☆) مفتی محمد وجیہ (پ: ۱۳۴۳ھ- ت: ۱۴۲۱ھ) قصبہ ٹانڈہ بادلی، ریاست رام پور میں ۳/محرم الحرام ۱۳۴۳ھ کو پیدا ہوئے، حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی نے ''محمد وجیہ'' نام رکھا، اور دعاؤں سے نوازا، آپ کے والد گرامی مولانا محمد نبیہ صاحب حضرت تھانوی کے خلیفہ ارشد اور ایک جید عالم دین اور صاحب نسبت بزرگ تھے، آپ کی والدہ محترمہ بھی حضرت تھانوی سے بیعت تھیں، اور آخر دم تک ان کے بتائے ہوئے وظائف پر سختی سے عمل پیرا رہیں، وہ ایک عابدہ زاہدہ خاتون تھیں، اس طرح ایک دینی گھرانے اور روحانی وعلمی ماحول میں مفتی صاحب نے پرورش پائی۔

ناظرۂ قرآن قاری عبداللہ صاحب بھیڑی والوں سے پڑھنے کے بعد ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ ٹانڈہ بادلی میں حاصل کی، خصوصیت سے فارسی کی تعلیم مولانا محمد علی دیوبندی (برادر مولانا محمد میاں دیوبندی) سے پھر عربی کی ابتدائی کتب کافیہ تک مولانا محمد صابر امروہوی (خلیفہ حضرت تھانوی) سے حاصل کی، کچھ سال امروہہ میں رہے، اس کے بعد ۱۳۶۱ھ میں جامعہ مظاہر علوم سہارن پور میں داخلہ لیا، اور ۱۳۶۳ھ میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی، اور سب سے اعلیٰ نمبر سے کامیابی حاصل کی، جس پر مدرسہ کی طرف سے خصوصی انعام ملا، یہاں تعلیم کے دوران حضرت تھانوی سے بیعت کی، اور اصلاحی تعلق مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری، صدر المدرسین مدرسہ ظاہر علوم سے قائم کیا، اور علمی فیض کے ساتھ روحانی فیض کا بھی سلسلہ جاری رکھا، یہاں کے اکابر اساتذہ حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوری، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، حضرت مولانا اسعداللہ صاحب سے شرف تلمذ حاصل کیا، ۱۹۶۴ء-۱۹۶۵ء میں فنون کی بقیہ کتب، کتب منطق وفلسفہ، اصول فقہ، علم حساب، علم ہیئت، اقلیدس وادب وغیرہ کی تکمیل کی، پھر ایک سال مدرسہ خانقاہ اشرفیہ تھانہ بھون میں پڑھایا، اس کے بعد ۱۹۴۷ء کا تقسیم ملک کا واقعہ پیش آیا، حالات بگڑ گئے، راستے خطرناک ہو گئے، تو گھر رہنے پر مجبور ہو گئے، اسی لئے وطن میں تجارت کرتے رہے، ۱۳۶۸ھ میں ایک سال مدرسہ اشرف المدارس ہردوئی (بقیہ اگلے صفحہ پر)

"عبارة عن فضل مال لا يقابله عوض فى معاوضة مال بمال،(فتح القدير،٦/١٤٧)، وقال فى العناية(ج٣/١٦٤): هو الفضل الخالى عن العوض المشروط فى البيع، وقال فى فتح القدير (٦/١٤٧) الزائد فى القرض والسلف على المدفوع والزائد فى بيع الأموال الربوية عند بيع بعضها بجنسه، وقال البعض: الفضل المشروط فى القرض والدين، وقال فى

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) میں، اس کے بعد ۱۳۶۹ھ میں مفتاح العلوم جلال آباد حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب کے یہاں پانچ سال تک تدریس کی خدمت انجام دی اور مسلم شریف پڑھانے کا موقع ملا، ۱۳۷۴ھ (۱۹۵۴ء) میں مولانا احتشام الحق مہتمم دارالعلوم اسلامیہ ٹنڈوالہ یار اور مولانا سلیم اللہ خاں صاحب نے پاکستان آنے کی دعوت دی، آپ نے یہ دعوت قبول کی اور دارالعلوم میں تدریسی خدمات انجام دینے لگے، اور ترقی کرتے کرتے شیخ الحدیث ہوئے، مولانا ظفر احمد عثمانی کی زیر نگرانی ۱۷ سال تک فتاوی کی خدمات بھی انجام دیتے رہے، جس کا سلسلہ تاحیات جاری رہا، مولانا عثمانی کے انتقال کے بعد بخاری اور ترمذی شریف کی مسلسل تدریس انجام دی، آپ کے سینکڑوں تلامذہ دینی، علمی و تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں، مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوری کے انتقال کے بعد مفتی اعظم پاکستان سے اصلاحی تعلق قائم کیا اور ان کی خلافت سے سرفراز ہوئے، مولانا مسیح اللہ خاں صاحب سے بھی خلافت حاصل ہوئی۔

بہرحال آپ ایک جید عالم دین، عظیم مفتی، محقق اور عارف تھے، نہایت متواضع، منکسر المزاج اور خندہ جبیں بزرگ اور اخلاق و عادات میں اکابر کا نمونہ تھے، مولانا عثمانی کی نگرانی میں آپ کے جو فتاوی درج رجسٹر ہیں ان کی تعداد بارہ ہزار ہے، جب کہ بے شمار فتاوی درج نہیں ہو سکے، مولانا عثمانی کی وفات کے بعد کے فتاوی کی تعداد الگ ہے، ۱۷/۱۸ سال میں ہی تقریباً ۱۹ ہزار فتاوی آپ کے قلم سے نکل چکے تھے۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: اکابر علماء دیوبند، مؤلفہ حافظ محمد اکبر شاہ صاحب بخاری۔)

مفتی محمد وجیہ شیخ الحدیث و سابق مہتمم دارالعلوم مظاہر العلوم حیدرآباد کی وفات حسرت آیات ۱۶ صفر المظفر ۱۴۲۱ھ مطابق ۲۱ مئی ۲۰۰۰ء بروز اتوار پاکستان میں ہوئی۔ (علماء مظاہر علوم سہارنپور وانجازاتہم العلمیۃ والتالیفیۃ ج ۲/ ازص ۱۹۴ تا ۱۹۷)، علماء مظاہر علوم اور ان کی تصنیفی خدمات، ج ۲/ ۳۸۵-۳۶۷)۔

البحر الرائق: (٦/٢٠٧،باب الربا) وهو فضل مال بلا عوض فى معاوضة مال بمال "

ان تعریفات سے معلوم ہوا کہ قرض میں جو زیادتی مقرر کی جاتی ہے وہ سود ہے، صورت مبحوث عنھا میں باقاعدہ معاملہ سود ہے، اس میں یہ طے ہوتا ہے کہ مثلاً فیصد اتنا روپیہ سود میں دینا ہوگا، اس کو ٹیکس میں داخل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ٹیکس میں چاہے مقدار ووقت مقرر بھی ہو مگر وہ یکطرفہ معاملہ ہوتا ہے، اس میں جتنا بھی ہو اپنے پاس سے دینا پڑتا ہے، عقد معاوضہ نہیں پایا جاتا، جانبین سے لین دین نہیں ہوتا، بلکہ معاملہ ہی کا اختیار نہیں ہوتا، مثلاً انکم ٹیکس، سیل ٹیکس وغیرہ وغیرہ، اس میں عقد نہیں ہے بلکہ ظلماً ایک مقدار مقرر کردی گئی ہے جو بہرحال ادا کرنی ہے، بخلاف صورت مبحوث عنھا کے کہ اس میں قرض لینے والا خوشی سے (چاہے کسی فرضی عذر کی بناء پر) قرض بشرط تفاضل لیتا ہے، حکومت زبردستی قرضہ نہیں دیتی، بہرحال یہاں پر عقد معاوضہ کے ساتھ موجود ہے اور کتاب اصول معاشیات کی تحریر کردہ ٹیکس کی تعریف کا یہ مقصد معلوم ہوتا ہے کہ بغیر عقد کے جو قانوناً وصول کیا جاتا ہے وہ ٹیکس ہے اور یہاں پر حکومت کا قانون یہ نہیں ہے کہ کوئی لے یا نہ لے، ہر ایک کو اتنا روپیہ دینا پڑیگا، بلکہ قرض لینے والوں کے لئے وہ قانون اور شرح سود جو مقرر ہوتی ہے وہ بمنزلہ عقد کے اور یہ تعیین مقدار وغیرہ صرف حکومت ہی کی طرف سے نہیں بلکہ ہر سود خوار کے یہاں شرح سود کی مقرر ہوتی ہے اور اس مقدار کے مطابق سود دینا لازم ہوتا ہے، بہرحال خلاصہ یہ ہے کہ قرضہ برسود کے نام سے حکومت جو کچھ لیتی ہے وہ سود ہی ہے، اگر کوئی ٹیکس کی تعریف ایسی بھی کردے جو سود کو شامل ہو جائے یا کوئی سود کا نام ہی ٹیکس رکھ دے اس سے سود کا حکم نہیں بدلے گا، جس کو شریعت نے سود کہہ دیا ہے وہ سود ہی رہے گا، نیز سود کو عوام کی ضروریات میں لگانے سے سود کا معاملہ ختم نہیں ہوتا۔

(۲) اللہ تعالیٰ نے سود کی حرمت کو مصالح پر مبنی نہیں رکھا بلکہ قطعی طور سے حرام فرمادیا جس

وقت سود کی حرمت نازل ہوئی تھی اس وقت مسلمان اب سے زیادہ احتیاج وافلاس میں تھے اور نیز بہت سا سود، ان معاملات کے متعلق باقی تھا جو زمانۂ جاہلیت اور حالتِ کفر میں ہوگئے تھے، اس پر بھی حکم ہوا کہ سود چھوڑ دو ورنہ خدا اور اس کے رسول کی طرف سے اعلان جنگ ہے، جب حالت کفر کے بقیہ سود کا وصول کرنا ہی ممنوع قرار دے دیا گیا تو ابتدائیہ معاملات کیسے جائز ہوں گے؟ لوگوں کے اعتبار اور احتیاج شارع کو معلوم نہیں؟ ان کے ہوتے ہوئے سود کو حرام قرار دیا گیا اور ضرورت وہ ہے جس کا شریعت اعتبار کرے، بہت سے لوگ اور قومیں اپنا خاص معیار زندگی اور خاص منصوبہ طے کر لیتے ہیں اور اپنے لئے خاص وضع تجویز کر لیتے ہیں پھر قلت مال کی وجہ سے اس منصوبہ کے پورا کرنے میں دقت پیش آتی ہے تو غلط طریقے سے مال حاصل کرنے کے طریقے سوچے جاتے ہیں، بہت سے اس قسم کے قرض لینے والے اپنے گھر کے ذخیرے، زیور، اسباب کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں کہ یہ بھی اپنے پاس رہے اور قرض سے کام چل جائے حالانکہ ضرورت یوں بھی پوری ہوسکتی تھی کہ اول اپنی سب چیزیں بیچ ڈالیں، یا اپنی شان اور وضع محفوظ رکھنے کے واسطے مزدوری محنت کرنے کو عار سمجھتے ہیں، سو عقلا وشرعا یہ ضرورتیں قابل اعتبار نہیں، پھر ان سب کے بعد اضطرار کے وقت مردار کھانا، بھیک مانگ لینا درست ہے، پس سودی قرض لینے کی کسی حالت میں ضرورت نہیں، پھر ضرورت نہ ہونے کے باوجود علاوہ دینی نقصان کے جو نقصانات سوال میں ذکر کئے گئے ان کا بھی خطرہ ہے، بہرحال جو مصالح ذکر کی گئی ہیں ان کی وجہ سے سود کی حرمت مرتفع نہیں ہوگی، زیادہ تر بربادی رسوم اور فضول خرچی سے آتی ہے، اس کے انسداد کی ضرورت ہے۔

(۳) حکام اعلی چاہے مسلمان ہوں یا کفار، ہر حال میں سود پر قرض لینا جائز نہیں ہے،

کیونکہ اس سے معاملہ سود میں کوئی فرق نہیں آتا، واللہ أعلم بالصواب، وإليه المرجع وإليه المآب۔

کتبہ محمد وجیہ غفرلہ
الجواب صحیح
ظفر احمد عثمانی (۱)
مدرسہ دارالعلوم الاسلامیہ
ٹنڈو الہ یار، ضلع حیدرآباد، سندھ، پاکستان

☆☆☆☆

(۱) علامہ ظفر احمد عثمانی ۵/اکتوبر ۱۹۹۲ء کو دیوبند میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم دیوبند سے حاصل کی، پھر تھانہ بھون، کان پور اور سہارن پور میں مختلف علماء ومشائخ سے فیض یاب ہوئے، ۱۹۵۴ء میں قیام پاکستان کے بعد ٹنڈو الہ یار چلے آئے جہاں ایک مدرسۃ العلوم قائم کیا اور آخری وقت تک اسی مدرسہ میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، آپ کی تصانیف میں: تحذیر المسلمین عن موالات المشرکین، امداد الاحکام، اعلاء السنن (۲۲ جلدیں) اور انوار النظر فی آثار الظفر سرفہرست ہیں۔

آپ حضرت تھانوی کے بھانجے تھے، اور حضرت تھانوی نے بیٹے کی طرح ان کی تربیت کی تھی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارن پوری کی طویل صحبت اٹھائی، اور متفرق اوقات میں مظاہر علوم کے استاد حدیث رہے، خانقاہ تھانہ بھون کے مفتی اور مصنف اور مدرسہ عالیہ کے شیخ الحدیث کی حیثیت سے سالہا سال علمی وتدریسی خدمت انجام دی، اعلاء السنن جیسی معرکۃ الآراء کتاب حضرت تھانوی کی سرپرستی میں تیار کردی جو علم حدیث کا شاہکار ہے، اور اس کے دو مبسوط مقدمے ''انہاء المسکن'' اور ''انجاء الوطن'' اس کے علاوہ ہیں، جدید تحقیقات کے ساتھ ۲۱/حصے اور ۱۳/مجلدات ہیں، اس کے علاوہ احکام القرآن ۵/جلدیں اور امداد الاحکام ۲/جلدیں ہیں، علمی خدمات کے علاوہ سیاسی واجتماعی خدمات بھی قابل قدر ہیں، افسوس کہ ۸/دسمبر ۱۹۷۴ء میں وفات ہوئی۔ (تفصیل کے لئے دیکھیں: نقوش رفتگاں، مفتی محمد تقی عثمانی)۔

تجاویز☆

تعمیر مکانات یا کاروباری حاجتوں کے لئے حکومت سے سودی قرض لینا جائز ہے یانہیں؟ اس مسئلہ میں مجلس نے متعدد علماء کبار سے استفتاء کیا اوران کے جوابات پر ارکان مجلس انفرادی اوراجتماعی طور پر غور وخوض کر کے جس نتیجہ پر پہونچے ہیں، وہ درج ذیل ہیں:

اس مسئلہ میں علماء کے آراء میں اختلاف ہے۔

(الف) بعض حضرات نے اسے بالکل ناجائز قرار دیا ہے، اوران کے قول کا مبنی صاحبین کا قول اور مسلک ہے، جسے بکثرت فقہاء احناف نے اختیار فرمایا ہے۔

(ب) اس کے برخلاف بعض حضرات نے اس مسئلہ میں تفصیل کی ہے یعنی ان کے نزدیک جن مقامات پر حکومت مسلمانوں کی ہے، وہاں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حکومت اگر قرض دے کر سود لے گی تو اس کے ذمہ دار گناہگار وخطا کار ہوں گے اور جو لوگ اس سے سودی قرض لیں گے وہ بھی گناہگار ہوں گے، دونوں حرام کے مرتکب کہے جائیں گے۔

لیکن جہاں حکومت واقتدار غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے وہاں ان حضرات کے نزدیک حکومت سے سودی قرض لینے کی گنجائش ہے، ان حضرات کی رائے امام اعظمؒ کے مسلک پر مبنی ہے، اس مسلک کے متعلق بھی علماء سلف نیز موجودہ علماء کے درمیان اختلاف ہے، بعض کے نزدیک یہ سود لینے اور دینے دونوں کے جواز کو شامل ہے اور اکثر کے نزدیک اس کا تعلق صرف لینے کے جواز سے ہے، سود دینے کا جواز اس سے نہیں نکلتا ہے، حضرت

☆ واضح رہے کہ یہ تجاویز منظور نہ ہوسکی تھیں۔

شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے پہلی صورت کو اختیار فرمایا ہے، یعنی وہ ایسے مقامات میں جہاں اقتدار وحکومت غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے، سود دینے کو بھی جائز سمجھتے ہیں۔ فتح القدیر میں بعض سابق فقہاء کی جانب بھی اسی قول کو منسوب فرمایا گیا ہے، مبسوط کی ایک عبارت بھی اس کی طرف منسوب ہے، ان سب امور کے پیش نظر مؤخر الذکر علماء (ب) کے نزدیک غیر مسلم حکومت کے ماتحت ممالک (مثلاً ہندوستان) میں اس کی گنجائش ہے۔

دونوں اقوال پر نظر کرنے کے بعد مجلس کا فیصلہ یہ ہے:

(۱) ان ممالک ومقامات میں جہاں اقتدار وحکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے حکومت سے سودی قرض لینے کی مطلقاً گنجائش نہیں ہے، ایسی حکومت کے لئے سود لینا اور پبلک کے لئے سود دینا دونوں باتیں حرام ہیں، مندرجہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ یہ جزء علماء کی مندرجہ بالا دونوں جماعتوں (الف، ب) کے درمیان مشترک اور متفق علیہ ہے۔

(۲) ان مقامات وممالک میں بھی جہاں اقتدار وحکومت غیر مسلموں کے ہاتھ میں ہے، مجلس کے نزدیک حکومت سے سودی قرض لینا جائز نہیں ہے اور انھیں حضرات علماء کی رائے بوجہ احوط کے قابل ترجیح ہے جو اسے ناجائز کہتے ہیں، لیکن اس موقع پر مجلس کے سامنے دو باتیں آجاتی ہیں۔

(الف) مجلس کی رائے میں جو علماء امام اعظمؒ کے قول میں عموم کے قائل ہیں، ان کے دلائل بھی ایسے نہیں ہیں کہ ان سے صرف نظر کی جاسکے۔

(ب) مجلس کے نزدیک اگرچہ اس قسم کا قرض لینے کی جو ضرورتیں بیان کی جاتی ہیں، وہ نہ تو ''اضطرار'' کے ہم معنی ہیں اور نہ ان کو ضرورت شرعیہ کہا جاسکتا ہے، اگر کسی مستحق کی کوئی خاص حالت ہو تو وہ اپنے مخصوص حالات ظاہر کر کے کسی دیندار معتمد عالم سے استفتاء کرے، یہاں ان مخصوص حالات سے بحث نہیں کی جاسکتی بلکہ عام حالات سے بحث ہے، لیکن باوجود اس کے مجلس اس حقیقت سے خوب واقف ہے کہ